اکبر الاعمال

(حقیقت واہمیت ذکر)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	تمہید	۷
۲	ذکر اللہ کی اہمیت	۸
۳	شعائر اللہ کی حقیقت واہمیت	۹
۴	تصدیق قلبی کی اہمیت	۱۰
۵	﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ کے معنی	۱۱
۶	ذکر اللہ سے غفلت	۱۱
۷	وظائف کا اہتمام	۱۲
۸	وسیلے کی حقیقت	۱۳
۹	ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا وسیلے سے انکار کی وجہ	۱۵
۱۰	اہتمام ادب	۱۶
۱۱	خدا کی شان میں بے ادبی	۱۶

۱۲	اَن نیاؤ نگر کا قصہ	۱۷
۱۳	اللہ تعالیٰ کی بے نیازی کا مطلب	۱۹
۱۴	عظمت ومحبت کا مقتضاء	۱۹
۱۵	رعایتِ ادب	۲۱
۱۶	حقیقت توسل	۲۲
۱۷	ذِکر کی دو قسمیں	۲۳
۱۸	مصیبت کی دو قسمیں	۲۴
۱۹	کفار کی گمراہی کی وجہ	۲۶
۲۰	آغوش کی دو قسمیں	۲۷
۲۱	حکایت	۲۸
۲۲	لفظ ''اَحَدی'' کی تحقیق اور حکایت	۲۹
۲۳	ذِکر کے بارے میں لوگوں کی غلط فہمی	۳۰
۲۴	دین ودنیا کا اجتماع	۳۱
۲۵	اہل اللہ کی شان	۳۱
۲۶	خواجہ عبیداللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کا مقام بلند	۳۳
۲۷	محبت کا ایک رنگ	۳۴

۲۸	محبتِ حق کی پہچان	۳۴
۲۹	انتخابِ پیر میں لوگوں کی غلط فہمی	۳۵
۳۰	اہل وعیال سے برتاؤ	۳۵
۳۱	لوگوں کی غلط فہمی کی مثال	۳۶
۳۲	ذِکر کی حقیقت	۳۷
۳۳	اشکال کا جواب	۳۸
۳۴	ذکرِ لسانی کا فائدہ	۳۹
۳۵	احسن تدبیر	۴۰
۳۶	علماء کی صحبت کا فائدہ	۴۱
۳۷	اللہ کے نام کا فائدہ	۴۲
۳۸	اللہ کی کریمی	۴۲
۳۹	درجاتِ ذکر کی تفصیل	۴۳
۴۰	”دوازدہ تسبیح“ میں ترتیب کی حکمت	۴۴
۴۱	ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا رد	۴۴
۴۲	ذاکرین کے درجات	۴۶
۴۳	تعلقاتِ الٰہی کے درجات	۴۶

۴۴	محبت کے مختلف انداز	۴۷
۴۵	ذکر اللہ کی مختلف صورتیں	۴۷
۴۶	مقاماتِ ذکر	۴۸
۴۷	احوالِ ذکر	۴۹
۴۸	ذکر کے لئے کوئی حد نہیں	۵۰
۴۹	ذکر قلبی ولسانی میں فرق	۵۰
۵۰	انسان کی بے بسی	۵۱
۵۱	سوال وجواب	۵۲
۵۲	دوسرا سوال اور اسکا جواب	۵۲

وعظ

اکبر الاعمال

(حقیقت واہمیت ذِکر)

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ وعظ بعض احباب کی درخواست پر ۱۵/ جمادی الثانی ۱۳۴۸ھ بروز جمعرات کو اپنی اہلیہ صغریٰ کے مکان میں دو گھنٹے کرسی پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔

جس میں ذکر اللہ کی ضرورت اور اُس کی حقیقت بتلاتے ہوئے فرمایا کہ ذکر اللہ تمام اعمال کی جڑ ہے۔

سامعین میں سے مرد حضرات کی تعداد تقریباً ۶۰ تھی اور مستورات پردے میں اس کے علاوہ تھیں ہر طبقہ کے لئے انتہائی مفید ہے۔

محدثِ کبیر علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے قلم بند فرمایا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارک وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ﴾(۱)

تمہید

میں نے جس حصہ آیت کی تلاوت کی ہے اس میں دو جملے ہیں۔ مقصود بالبیان صرف پہلا جملہ ہے دوسرے کو برکت کے لئے پڑھ دیا ہے۔ مقصود ﴿وَلَذِكْرُ اللَّهِ اَكْبَر﴾ کا بیان کرنا ہے۔ سامعین غالبًا اس کی تلاوت ہی سے سمجھ گئے ہوں گے۔ کہ مقصود ذکراللہ کے متعلق کچھ کہنا ہے اور شاید متبادر یہ ہوا ہو(۲) کہ میں ذکراللہ کی فضیلت بیان کروں گا۔ کیونکہ آج کل واعظین زیادہ تر اعمال کے فضائل ہی بیان کرتے ہیں۔ مگر مجھے فضیلت کا بیان کرنا مقصود نہیں۔ کیونکہ آج کل اعمال کے فضائل سے تو اکثر لوگ واقف ہیں۔ البتہ ان کی ضرورت سے غافل ہیں گو وہ شعائر دین ہی سے کیوں نہ ہوں اور جو اعمال شعائر دین سے نہ ہوں اُن کی ضرورت سے تو بہت سے اہل علم بھی غافل ہیں حالانکہ بعض اعمال گوشعائر دین سے نہیں مگر

(۱) ''اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو جانتا ہے'' سورۂ عنکبوت:۴۵

(۲) شاید ان کے دل میں یہ بات آئی ہو کہ۔

شعائر دین کی اصل اور جڑ ہیں۔ اس لئے ضرورت میں وہ شعائر سے کم نہیں۔ مگر عام طور پر ان کو ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ بہت لوگ پھلوں سے تو واقف ہیں اور باغ میں جا کر پھلوں اور پتوں کو دیکھتے ہیں مگر جڑوں کو کوئی نہیں دیکھتا نہ کسی کا اُن کی طرف خیال جاتا ہے کیونکہ جڑوں کے ساتھ پھلوں اور پتوں کا تعلق نظری ہوگیا ہے۔ بوجہ اس تعلق کے مستور ہونے کے (۱) تو جیسا حسیات میں جڑوں کی طرف توجہ کم ہے اسی طرح شرعیات میں ہماری بعینہ یہی حالت ہے کہ جڑ سے غافل ہیں محض فروع پر نظر ہے (۲)۔ اسی لئے اعمال کے فضائل پر سب کی نظر ہے۔ ضرورت پر بہت کم نظر ہے اور اس میں زیادہ خطا عوام کی نہیں بلکہ خطا ہماری ہے کہ ہم تعلیم کرنے والے بھی زیادہ تر فضائل ہی کو بیان کرتے ہیں۔ ضرورت کو بیان نہیں کرتے اور یہ بڑی کوتاہی ہے، میں ضرورت کو بیان کروں گا۔

ذِکر اللہ کی اہمیت

ترجمہ آیت کا یہ ہے ''ذکر اللہ بہت بڑی چیز ہے'' ظاہر میں لوگ اس سے یہی سمجھے ہوں گے کہ صرف فضائل کی وجہ سے بڑی چیز ہے۔ مگر اس کے علاوہ ذکر اللہ ضرورت کی وجہ سے بھی بڑی چیز ہے۔ اس طرح سے وہ فی نفسہٖ ضروری ہے۔ اور دیگر ضروریات کی جڑ بھی ہے۔ گو یہ شعائر دین میں سے نہیں (۳)۔ مگر حقیقت میں یہ شعائر کی بھی جڑ ہے۔ شعائر دین وہ اعمال ہیں جو اسلام کی کھلی علامات ہیں جن سے دوسروں کو یہ معلوم ہوجائے کہ ان اعمال کا بجالانے والا مسلمان ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ جو چیز کھلی علامت نہ ہو وہ ضروری بھی نہ ہو بلکہ

(۱) جڑوں کا پتوں اور پھلوں سے تعلق چونکہ نظر نہیں آتا اس لئے وہ دلیل کا محتاج ہے (۲) شاخوں پر نظر ہے (۳) علامات دین میں سے نہیں۔

ممکن ہے کہ ایک عمل شعائر میں سے نہ ہو لیکن شعائر کی بھی جڑ ہو، حسیات میں اس کی مثال بال کمانی جیسی ہے۔ ظاہر میں وہ گھڑی کا بڑا پرزہ نہیں بلکہ چھوٹا سا پرزہ ہے جس کو دیکھ کر ناواقف شاید یہ سمجھے کہ معمولی چیز ہے۔ مگر درحقیقت سب پرزے اسی وقت کارآمد ہیں جب بال کمانی درست ہو ورنہ سب بیکار ہیں۔ یعنی گھڑی سے جو مقصود ہے وہ بدون اس کے (۱) حاصل نہیں ہوسکتا۔ گو اس کی خوبصورتی میں کمی نہ آئے اور جیب میں رکھنے سے دیکھنے والے بھی سمجھیں گے کہ آپ کے پاس گھڑی ہے۔

اسی طرح ذکر اللہ کو سمجھئے کہ گو خود نماز روزے کے درجہ میں شعائر میں سے نہیں۔ مگر تمام شعائر کی جڑ اور بنیاد ہے۔

شعائر اللہ کی حقیقت واہمیت

اور شعائر کی حقیقت تو یہ ہے کہ شریعت کو بعض انتظامات بھی مقصود ہیں۔ اس لئے شریعت نے بعض اعمال کو مصلحت انتظام سے اسلام کی علامات قرار دے دیا ہے کہ جن سے لوگوں کو ایک دوسرے کے اسلام کا علم ہو جائے اور احکام اسلام کا اس پر اجراء کیا جائے یہ علامات شعائر ہیں اور یہ ضروریات دین میں سے ہیں۔ یعنی جن کا جزو دین ہونا خاص و عام ہر کسی کو معلوم ہے اور ضروریات کا درجہ اتنا بڑا ہے کہ اگر کوئی شخص ضروریات کا منکر ہو خواہ وہ انکار تاویل سے ہو یا بدون تاویل کے وہ کافر ہے اور اس کا یہ عذر بھی نہ سنا جاوے گا کہ مجھ کو علم نہ تھا۔ بخلاف غیر شعائر کے مثلاً کوئی رہن وغیرہ کا انکار کرے وہ علی الاطلاق کافر نہ ہوگا۔ بلکہ اس میں یہ تفصیل ہوگی کہ اگر آیت قرآنیہ سننے کے بعد انکار کرے تو کافر ہوگا ورنہ نہیں کیونکہ مسئلہ رہن کا جزوِ دین ہونا بالمعنی مذکور ضروریات میں سے نہیں اور نماز، روزہ، زکوٰۃ وحج وغیرہ کا جزوِ دین ہونا ضروریات سے ہے۔ ان کا انکار مطلقاً کفر ہے یہاں یہ عذر

(۱) بغیر اس کے۔

بھی مسموع نہ ہوگا کہ مجھے اس کے جزوِ دین ہونے کا علم نہ تھا گو عنداللہ معذور ہو (اگر واقعی اس کو علم نہ تھا) مگر یہ عذر قضاء مسموع نہ ہوگا(۱) حاکم اسلام اس پر کفر کا حکم لگا کر بینونیت زوجہ(۲) وغیرہ کا حکم جاری کردے گا۔ (اَلَا اَنْ یَّکُوْنَ قَدْ اَسْلَمَ فِی دَارِالْحَرْبِ ثُمَّ هَاجَرَ فَاِنْکَارُهٗ قَبْلَ الْهِجْرَةِ لَا یَکُوْنُ کُفْراً لِظُهُوْرِ عُذْرِهٖ فِیْ عَدَمِ الْعِلْمِ ۱۲)(۳)

غرض حکمتِ انتظام واجراءِ احکام کی وجہ سے بعض اعمال کو شعائر میں سے قرار دیا گیا ہے۔

تصدیقِ قلبی کی اہمیت

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو شعائر نہ ہوں وہ ضروری نہیں۔ دیکھئے ایک تصدیق بالقلب (۴) ہی ہے۔ گو یہ شعائر اصطلاحیہ میں سے نہیں ہاں اقرار باللسان (۵) شعائر میں سے ہے۔ مگر کیا تصدیق ضروری بھی نہیں؟ یہ عجیب مثال اس وقت ذہن میں آئی جس سے میرا دعویٰ بخوبی ثابت ہوگیا کہ یہ ضروری نہیں کہ جو شعائر میں سے نہ ہو وہ ضروری نہ ہو۔ کیونکہ ایمان واسلام کے لئے تصدیق بالقلب کی ضرورت پر سب کا اتفاق ہے مگر اس کو شعائر میں سے اس لئے شمار نہیں کیا گیا کہ شعائر سے جو مقصود ہے یعنی ظہور ایمان واجراء احکام (۶) وہ اس سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ تصدیق قلبی کی کسی کو اطلاع نہیں ہوسکتی۔ مگر ضروری ایسا ہے کہ تمام اعمال کی جڑ ہے بلکہ ایمان واسلام کا مدار حقیقی اسی پر ہے۔ بدون تصدیق بالقلب کے عنداللہ کوئی شخص مسلمان نہیں گو ظاہر میں اس کو مسلمان کہا جاتا ہو۔ پس یہ ہم لوگوں کی بڑی کوتاہی ہے کہ ہم نے ضرورت کو صرف شعائر تک محدود کر رکھا

(۱) مگر اس کا یہ عذر قابل قبول نہ ہوگا (۲) بیوی سے علیحدگی اختیار کرنے کا حکم دیگا (۳) مگر یہ کہ وہ دارالکفر میں اسلام لایا پھر اس نے ہجرت کی ہو تو ہجرت سے پہلے اس کا انکار کرنا کفر نہیں ہوگا کیونکہ اس کو علم نہ ہونے کا عذر ظاہر ہے (۴) دل سے یقین کرنا (۵) زبان سے اقرار کرنا (۶) ایمان کا اظہار اور احکام کا اس پر جاری ہونا۔

ہے اور جو اعمال شعائر سے نہ ہوں ان کو ضروری نہیں سمجھتے تصدیق کی مثال نے اس غلطی کو اچھی طرح واضح کر دیا اور بتلا دیا کہ جو اعمال شعائر دین سے شمار کئے گئے ہیں ان کو شعائر اسلام صرف اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ لوگوں کو ان کے ذریعہ سے ایک دوسرے کا اسلام بسہولت معلوم ہو جاتا ہے اس سے یہ سمجھ لینا کہ جو شعائر نہیں وہ غیر ضروری ہیں سخت غلطی ہے۔

﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ کے معنٰی

پس ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ذکر اللہ اس وجہ سے بھی اکبر ہے کہ افضل ہے اور اس واسطے بھی اکبر ہے کہ وہ تمام فضائل کی جڑ ہے۔ نیز تمام اوامر ونواہی کے امتثال واجتناب کی بھی جڑ ہے۔ اور اکبر میں دو احتمال ہیں یا تو مقطوع عن الاضافت ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ ذکر اللہ فی نفسہ بہت بڑی چیز ہے یا مفضل علیہ کی طرف اضافت ملحوظ ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ تمام اعمال سے اکبر ہے یہ تو آیت کی توجیہ تھی اب اس کی ضرورت کو سنیئے جس سے بہت لوگ غافل ہیں۔

ذِکر اللہ سے غفلت

اول تو لوگوں کو آج کل دین کا اہتمام ہی کم ہے اور جن کو ہے بھی تو وہ نماز فرض اور نوافل ومستحبات کا تو اہتمام کرتے ہیں۔ مگر ذکر اللہ سے غافل ہیں یہاں شاید کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب تم کو یہ تسلیم ہے کہ لوگوں کو مستحبات کا اہتمام ہے اور مستحبات میں تلاوت قرآن پاک بھی داخل ہے اور تلاوت قرآن کا بہت لوگوں کو اہتمام بھی ہے پھر یہ کہنا کیونکر صحیح ہوا کہ ذکر اللہ کا اہتمام نہیں کیونکہ تلاوت قرآن بھی تو ذکر اللہ کی بڑی فرد ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ میری مراد ذِکر حقیقی ہے اور وہی اکبر کا مصداق ہے اس کا اہتمام بہت کم ہے رہی تلاوت قرآن پاک تو وہ ذکر کی ایک صورت ہے اس کے اہتمام سے یہ لازم نہیں آیا کہ ذکر حقیقی کا بھی اہتمام ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ بعض اعمال کی صورت پائی جاوے مگر اس کی حقیقت نہ پائی جائے ورنہ اگر حقیقت پائی جاتی تو اس کے سب آثار لازمہ ضرور پائے جاتے۔

وظائف کا اہتمام

جیسے مدار یا فقیروں کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وظیفوں کے بڑے پابند ہیں بزرگوں کا شجرہ روزانہ پڑھتے ہیں مگر نماز روزہ سے کچھ واسطہ نہیں معلوم ہوا اس کو حقیقت ذکر حاصل نہیں۔ یہی حاصل ہے میری شکایت کا۔

شجرہ پڑھنے پر مجھے علی حزیں کی حکایت یاد آئی (یہ ایرانی شہزادہ ہے۔ بڑا شاعر تھا حزیں اس کا تخلص ہے گو شاعر حزیں نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ مسرور رہتا ہے اور مسرت کے سامان جمع کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو وہ برائے نام حزیں تھا۔ حقیقت میں حزیں نہ تھا بلکہ بڑا مسخرہ تھا) وہ دہلی آیا تو ایک رئیس کا مکان کرایہ پر لیا چونکہ نازک مزاج تھا۔ اس لئے رئیس نے اس کی راحت کا سامان پوری طرح مہیا کیا۔ اس کے ایک گوشہ میں مدار یا فقیر رہتا تھا۔ جو رات کو بہت سویرے سے اٹھ کر بزرگوں کا شجرہ پکار پکار کر پڑھتا تھا جس سے علی حزیں کی نیند اُڑ گئی۔ پھر وہ فقیر تو شجرہ پڑھ کر شاید سو بھی گیا ہو کیونکہ صبح کی نماز کی اس کو کچھ ضرورت نہ تھی مگر علی حزیں صبح تک کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح کو وہ رئیس مزاج پرسی کو آئے کہ جناب کو کسی قسم کی تکلیف تو نہیں علی حزیں نے کہا اور تو سب راحت ہے البتہ ایک تکلیف ہے اس کو رفع کر دیجئے وہ یہ کہ اس تذکرۃ الاولیاء کو یہاں سے الگ کر دیجئے، تذکرۃ الاولیاء خوب لقب دیا کیونکہ شجرہ میں بزرگوں کا تذکرہ ہی ہوتا ہے۔

تو ان لوگوں کو وظیفہ کا تو اہتمام ہوتا ہے مگر دوسرے اعمال کا اہتمام نہیں ہوتا، تھانہ بھون میں ایک صاحب اب بھی زندہ ہیں انہوں نے خود مجھ سے کہا کہ میری نماز تو چاہے قضا ہوجائے مگر پیر کا بتایا ہوا وظیفہ قضا نہیں ہوتا، کیا اس وظیفہ کو آپ ذکر حقیقی کہہ سکتے ہیں ہرگز نہیں یہ کیسا ذکر حقیقی ہے کہ دوسرے اعمال اس سے متخلف ہوگئے۔ معلوم ہوا کہ یہ ذکر حقیقی نہیں بلکہ محض صورتِ ذکر ہے۔

وسیلے کی حقیقت

شاید یہاں کسی کو یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ بزرگوں کے شجرہ کو تم نے ذکر میں کیونکر داخل کیا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ شجرہ کا حاصل دعا مع التوسل ہے اور دُعا ذکر کی فرد ہے یہ تو وہ شجرہ ہے جس میں بزرگوں کے واسطہ سے دعا مانگی جائے جیسے ہمارے حاجی صاحب کا شجرہ ہے اور ایک شجرہ دوسرا ہے کہ پیر کے نام کا وظیفہ پڑھا جائے (جیسے یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ ۱۲ ظ) یہ ناجائز ہے اور ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ تو پہلے شجرہ کو بھی ناجائز کہتے ہیں کیونکہ وہ توسل بالاموات کو مطلقاً منع کرتے ہیں (۱) گو مسئلہ اجتہادی ہے مگر ہم یہ ضرور کہیں گے کہ اُن کی رائے صحیح نہیں۔ کیونکہ توسل کا حاصل یہ ہے کہ اے اللہ فلاں بزرگ کے طفیل سے ہمارے حال پر رحمت فرما اَب اس میں صرف اشکال یہ ہے کہ اس بزرگ کی بزرگی کو رحمتِ حق میں کیا دخل اور اس سے کیا تعلق ہے؟ اس اشکال کو میں نے بہت سے علماء سے حل کرنا چاہا مگر کسی سے حل کی اُمید نہ تھی۔ ایک جگہ اُمید تھی کہ یہ اشکال حل ہو جاتا مگر وہاں ادب کی وجہ سے زیادہ عرض کی ہمت نہ ہوئی یعنی حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہٗ سے حل کی امید تھی مگر میں نے حضرت سے جو عرض کیا کہ حضرت توسل کی کیا حقیقت ہے؟ تو فرمایا سائل کون ہے؟

(۱) مُردوں کے وسیلے سے دعا کو منع کرتے ہیں۔

حضرت نے میری آواز اُس وقت نہ پہچانی اور بینائی بھی زائل ہوچکی تھی، میں نے عرض کیا اشرف علی سائل ہے۔ حضرت نے تعجب سے فرمایا کہ تم توسل کی حقیقت پوچھتے ہو؟ بس میں خاموش ہوگیا۔ پھر عرض کرنے کی ہمت نہ ہوئی یا تو اس واسطے کہ مکرر سوال کرنے میں کرکری ہوگی(۱) کہ ایسی آسان بات بھی معلوم نہ ہوئی یا یوں کہو کہ اَدب کی وجہ سے خاموش ہوگیا اور یہ سمجھا کہ حضرت اس وقت اس مسئلہ کو بیان کرنا نہیں چاہتے۔ مگر حضرت کی شان یہ تھی ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال مشکل از حل شود بے قیل وقال

گو حضرت نے بظاہر توسل کی حقیقت بیان نہیں فرمائی۔ مگر حضرت کی برکت سے اشکال حل ہوگیا اور مجھے خود بخود اس کی حقیقت معلوم ہوگئی غور سے سنئے کیونکہ یہ حقیقت اس عنوان سے کتابوں میں آپ کو نہ ملے گی اور اس کے یاد کر لینے سے بڑا اشکال حل ہوجائے گا۔ وہ یہ کہ توسل بالصلحاء کی جو صورت ہے کہ اے اللہ فلاں بزرگ کے طفیل سے ہمارے حال پر رحم فرما اس کی حقیقت یہ ہے کہ اے اللہ! فلاں شخص میرے نزدیک آپ کا مقبول ہے اور مقبولین سے محبت رکھنے پر ((المرء مع من احب)) (۲) میں آپ کا وعدۂ رحمت ہے میں آپ سے رحمت کو مانگتا ہوں پس توسل میں یہ شخص اپنی محبت کو اولیاء اللہ کے ساتھ ظاہر کرکے اس محبت پر رحمت و ثواب مانگتا ہے اور محبت اولیاء کا موجب رحمت وثواب ہونا نصوص سے ثابت ہے چنانچہ متحابین فی اللہ کے فضائل سے احادیث بھری ہوئی ہیں(۳) اب یہ اشکال جاتا رہا کہ بزرگ کی بزرگی اور برکت کو رحمت حق میں کیا دخل؟ دخل یہ ہوا کہ اس بزرگ سے محبت رکھنا حب فی اللہ کی فرد ہے اور حب فی اللہ پر ثواب کا وعدہ ہے

(۱) شرمندگی ہوگی (۲) ''انسان کو جس سے محبت ہو اس کے ساتھ حشر ہوگا'' الصحیح للبخاری: ۱۵/۴۱۵

(۳) اللہ کی وجہ سے محبت رکھنے والوں کے فضائل احادیث میں بکثرت آتے ہیں۔

اس تقریر کے بعد میں ﴿اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ پر عمل کر کے تحدث بالنعمت کے طور پر کہتا ہوں کہ ابن تیمیہ اگر یہ تقریر سنتے تو توسل کے جواز کا ہرگز انکار نہ کر سکتے کیونکہ اِس کے سب مقدمات صحیح ہیں۔

ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا وسیلے سے انکار کی وجہ

میرا حسنِ ظن یہ ہے کہ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانے کے جاہلوں کے توسل کو منع فرمایا ہے جس کی حقیقت استعانت واستغاثہ ہے (یا یہ کہ وہ لوگ اولیاء اللہ کو کارخانۂ قدرت میں دخیل کار سمجھتے تھے کہ خدا تعالیٰ نے بہت سے کام ان کے سپرد کر دیئے ہیں وہ ان کے واسطے ہی سے ہو سکتے ہیں ۱۲ظ) آج کل بھی اس خیال کے لوگ بہت موجود ہیں جیسے ایک درویش کے مریدوں کو دیکھا گیا ہے کہ اُن کے نام کا وظیفہ پڑھتے ہیں۔ میں نے ان درویش کو تو نہیں دیکھا اس لئے ان کو میں کچھ نہیں کہتا مگر ان کے مریدوں کو دیکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ وارث خدا تعالیٰ کا نام بھی تو ہے یا وارث کا وظیفہ ممنوع کیوں ہے، میں کہتا ہوں کہ کیا خدا تعالیٰ کا نام وارث ہی ہے؟ سب ناموں کو چھوڑ کر اسی کا وظیفہ کرنا اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ نعوذ باللہ خدا بھی اس واسطے پسند آیا کہ پیر کا ہم نام ہے استغفر اللہ استغفر اللہ، اور یہ نیت نہ بھی ہو تو اس کا ایہام (۱) تو ہے اور شریعت نے ایہام سے بھی منع کیا ہے ہماری جماعت میں بھی پچھلے دنوں مرض آ گیا تھا کہ بعض لوگ خطوط میں اور تحریرات میں ''بامداداللہ'' اور ''ھوالرشید'' لکھنے لگے تھے میں نے اس سے منع کیا اور میں کیا بتلاؤں کہ مجھے اس سے کس قدر تکلیف ہوتی تھی مجھے تو اس میں سے بوئے شرک آتی تھی کیا اس کی جگہ ''بعون اللہ'' نہیں لکھ سکتے تھے۔

(۱) اس کا وہم تو ہوتا ہے۔

اہتمامِ ادب

صاحبو! ادب اور محبت تو وہ چیز ہے کہ کانپور میں عبدالرحمٰن خان صاحب مالک مطبع نظامی کے حجام کا نام بھی عبدالرحمٰن تھا تو خان صاحب کے خاندان نے اس کا نام بدل کر عبداللہ رکھ دیا تھا تاکہ ندا کے وقت خان صاحب کو ایذا نہ ہو اور اشتراک ومساوات کا ایہام نہ ہو۔ پھر کیا صوفیوں اور عالموں کو اشتراک ومساوات کے ایہام سے نہ بچنا چاہیئے۔

خدا کی شان میں بے ادبی

مگر افسوس یہ ہے کہ آج کل لوگ خدا تعالیٰ کا ادب نہیں کرتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تو کچھ ادب کرتے بھی ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کا بالکل ہی ادب نہیں کرتے اور اس کے بارے میں ایک مصرع بھی مشہور ہے ؎

باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار(۱)

مگر اول تو اس کے متعلق یہ سوال ہے کہ یہ کون سی نص ہے جس کی تقلید جائز ہو دوسرے اگر کسی عارف کا قول ہو تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کو ندا کر سکتے ہیں کہ اے اللہ تعالیٰ مجھے روزی دے دے اس طرح حضور کا نام نہ لو بلکہ آپ کے نام کے ساتھ تعظیمی الفاظ ملانا چاہیئے اور اللہ تعالیٰ کو اس طرح ندا کرنا اس واسطے جائز ہے کہ توحید پر دال ہے دوسرے اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے لازم ہے اور کثرت ذکر میں قیود دشوار ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بے ادبی کی یہ حالت ہے کہ جب کوئی جوان موت ہوتی ہے تو اس وقت برادری کے لوگ جمع ہو کر کہتے ہیں کہ اے ہے! کیسی بے وقت موت ہوئی بے چارے کے چھوٹے چھوٹے بچے

(۱) خدا کے ساتھ دیوانے بن کر رہو مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں ہوشیار رہو۔

بے سرے رہ گئے، گویا اس کا تو فیصلہ کرلیا کہ یہ موت بے موقع و نامناسب ہوئی اس کے بعد بوجھ بجھکڑ صاحب (یعنی جو عقلمند شمار ہوتے ہیں ۱۲ظ) فرماتے ہیں کہ بھائی کسی کو تقدیر میں دم مارنے کی جگہ نہیں ہے خدا کی ذات بڑی بے پرواہ ہے گویا انہوں نے اس بے موقع محل کی وجہ خدا تعالیٰ کی بے پرواہی کو قرار دیا تو نعوذ باللہ ان کے نزدیک بے پرواہ ہونے کے معنی یہ ہوئے کہ ان کے یہاں کوئی نظم نہیں کسی کے حال پر رحم نہیں پس اَودھ کی سلطنت ہے یا اَن نیاؤنگر ہے(۱) کہ عدل وانصاف کا خیال ہی نہیں۔

اَن نیاؤنگر کا قصہ

اَن نیاؤنگر کا ایک قصہ عوام میں مشہور ہے کہ ایک گرو اور ایک چیلہ جارہے تھے ایک بستی پر گذر ہوا جس کا نام اَن نیاؤنگر معلوم ہوا وہاں دیکھا کہ ہر چیز کا ایک ہی بھاؤ ہے دودھ بھی سولہ سیر کا اور گھی بھی سولہ سیر کا غلہ بھی سولہ سیر کا، گرو نے چیلہ سے کہا یہ جگہ رہنے کی نہیں یہ تو اَن نیاؤنگر ہے یہاں انصاف کا نام نہیں ہر چیز کا ایک ہی بھاؤ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہاں چھوٹے بڑے میں کچھ فرق نہیں یہاں رہنے میں خطرہ کا اندیشہ ہے، چیلہ نے کہا نہیں یہاں گھی دودھ بہت سستا ہے۔ یہاں ضرور قیام کرلو گھی دودھ خوب ملے گا گرو نے کہا اچھا مگر مجھے خطرہ ہے، چیلہ کھاپی کر بہت موٹا ہوگیا کچھ عرصے بعد راجہ کے ایوان پر گذر ہوا جہاں ایک مقدمہ پیش تھا۔ مقدمہ یہ تھا کہ دو چور چوری کرنے چلے ایک مکان میں نقب دیا پھر ایک چور نقب کے اندر گھسا دوسرا باہر تھا نقب میں اوپر سے اینٹیں گرگئیں جس سے وہ چور مرگیا، تو دوسرا چور مدعی تھا کہ اس کی اینٹوں سے میرا رفیق مرگیا اس مکان والے کو سزا ہونی چاہیئے۔ راجہ نے مالک سے پوچھا ایسا مکان کیوں

(۱) ایک بے انصافی کی بستی مشہور ہے۔

بنایا؟ اس نے کہا یہ معمّار کا فعل ہے، معمّار کو بلا کر باز پرس ہوئی اس نے کہا گارا مزدور لاتا تھا وہ گارا پتلا لایا جس سے تعمیر مضبوط نہ ہوئی، مزدور بلایا گیا اس نے کہا یہ سقہ کا فعل ہے اس نے پانی زیادہ چھوڑ دیا گارا پتلا ہوگیا، سقہ کو بلا کر پوچھا گیا اس نے کہا اُس وقت ایک مست ہاتھی بھاگا ہوا آیا تھا میں بدحواس ہوگیا پانی زیادہ گر گیا، فیل بان بلایا گیا اس نے کہا کہ میری خطا نہیں ایک عورت میرے ہاتھی کے سامنے آگئی اس کے زیور کی جھنکار سے ہاتھی بدک گیا، اس عورت کو بلایا گیا عورت نے کہا میری خطا نہیں سنار کی خطا ہے اس نے زیور میں باجہ ڈال دیا، سنار کو بلایا گیا سنار کے پاس کچھ معقول عذر نہ تھا وہ خاموش ہوگیا۔ اس غریب کو پھانسی کا حکم ہوگیا۔ پھانسی کا پھندا اس کے گلے سے بڑا تھا اطلاع کی گئی کہ اس کے گلے میں پھندا نہیں آیا بڑا ہے، حکم ہوا کہ اچھا سنار کو چھوڑ دو کسی موٹے آدمی کو پھانسی دے دو۔ وہاں سارے مجمع میں یہ چیلہ سب سے موٹا تھا اس کو پھانسی کے واسطے لے گئے چیلہ بڑا گھبرایا اور گرو سے کہا مجھے بچاؤ گرو نے کہا میں نے تجھ سے نہ کہا تھا کہ یہ جگہ رہنے کی نہیں دودھ گھی کھانے کا مزہ اور دیکھ، کہا میری توبہ ہے اب تو مجھے بچالو! پھر ایسی مخالفت نہ کرونگا گرو نے پھانسی والوں سے کہا کہ اس کو چھوڑ دو مجھے پھانسی دے دو چیلہ نے جو یہ دیکھا کہ میری خاطر گرو خود پھانسی پر چڑھنے کو تیار ہوگیا۔ اس کے دل نے یہ گوارا نہ کیا کہ میں زندہ رہوں اور گرو کو میری وجہ سے پھانسی ہو اس نے کہا ہرگز نہیں بلکہ مجھے پھانسی دو۔ اب دونوں میں جھگڑا ہونے لگا۔ چیلہ کہتا مجھے پھانسی دو اور گرو کا اصرار تھا کہ مجھے دے دو۔ اس کی اطلاع راجہ کو ہوئی اس نے گرو کو بلایا اور پوچھا تم کس واسطے جھگڑ رہے ہو اس نے کہا حضور مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ گھڑی ایسی ہے کہ جو اس وقت پھانسی پائے گا سیدھا بیکنٹھ میں جائے گا۔(۱) اس لئے میں چاہتا ہوں کہ مجھے پھانسی مل جائے راجہ نے کہا اچھا یہ بات ہے تو بس ہم کو پھانسی دے دو۔ چنانچہ راجہ کو پھر پھانسی دے دی گئی" خس کم

(۱) سیدھا جنت میں جائیگا۔

جہاں پاک‘‘(۱) سارا جھگڑا ہی مٹ گیا۔ گرو نے چیلہ سے کہا کہ بس اب یہاں سے چل دو یہ جگہ رہنے کے قابل نہیں ہے۔

یہ قصہ یونہی ایک مثل سی معلوم ہوتی ہے مگر اس میں بدنظمی اور بے انصافی کا فوٹو خوب کھینچا گیا ہے تو آج کل لوگوں نے خدا تعالیٰ کو نعوذ باللہ اَن نیاؤنگر کا راجہ سمجھ لیا ہے کہ نامناسب اور خلاف مصلحت اور بے موقع کام کرتے ہیں اس مضمون کو آج کل اس جملہ سے ادا کیا جاتا ہے کہ خدا کی ذات بڑی بے پرواہ ہے۔ جس موقع پر یہ جملہ استعمال کیا جاتا ہے کفر کو مستلزم ہے(۲) مگر یہ دیوبندی علماء کا حوصلہ ہے کہ ان لوگوں پر کفر کا فتوی نہیں دیتے کیونکہ ان کو اس کے کفر ہونے کی خبر نہیں نہ کفر کی نیت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی بے نیازی کا مطلب

صاحبو خدا تعالیٰ کا بے پرواہ ہونا بھی صحیح ہے مگر پرواہ کے دو معنی ہیں ایک احتیاج دوسرے توجہ اور رعایت، پس خدا تعالیٰ اس معنی کر تو بے پرواہ ہیں کہ کسی کے محتاج نہیں اور اس معنی کر بے پرواہ نہیں ہیں کہ کسی کی مصلحت کی رعایت نہیں کرتے بلکہ وہاں مراعات مصالح کامل طور پر ہیں (۳) مگر اس کی ضرورت نہیں کہ خدا تعالیٰ اپنے افعال کی تم کو مصلحت بھی بتلائیں اور نہ ہم کو اس کا منتظر رہنا چاہیئے کہ مصالح معلوم کریں۔ ہمارا مذہب تو یہ ہے ؎

عظمت ومحبت کا مقتضاء

زبان تازہ کردن باقرار تو　　نیگیختن علت ازکار تو (۴)

اور یہ مذہب ہے ؎

ہرچہ آں خسرو کند شیریں بود (۵)

---

(۱) ایک کمینہ مرا اور یہ دنیا اس کی کمینگی سے پاک ہوگئی (۲) اس جملہ سے کفر لازم آتا ہے (۳) مصلحتوں کی رعایت مکمل طور پر کرتے ہیں (۴) میں تو آپ کے ذکر سے اپنی زبان کو تر وتازہ رکھتا ہوں مجھے آپ کے احکام کی علتوں سے کوئی سروکار نہیں ہے (۵) اللہ جو کرتے ہیں بہتر ہی ہوتا ہے۔

صاحبو! ایک ادنیٰ محبوب سے بھی اس کا کوئی عاشق اس کے افعال واحکام کی علت وحکمت نہیں پوچھتا محض اس وجہ سے کہ اُس کے ساتھ محبت ہے نیز حکام اور آقاؤں سے بھی ان کے احکام کی علت وحکمت نہیں پوچھی جاتی کیونکہ دل میں ان کی عظمت ہے۔ اصل یہ ہے کہ محبت وعظمت سوال عن الحکمت اور انتظار علم حکمت سے مانع ہے (۱) اب جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام وافعال کی علت وحکمت معلوم کرنے کے درپے ہیں درحقیقت ان کے دل میں خدا اور رسول کی محبت و عظمت جیسی ہونی چاہیئے ویسی نہیں ہے۔

پس خدا تعالیٰ کا بے پرواہ ہونا بمعنی غیر محتاج ہونا صحیح ہے چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾ (۲) اس میں طاعات خلق سے استغناء ظاہر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے مجاہدات و طاعات کی حاجت نہیں ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿إِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۖ وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ﴾ (۳) اس میں معاصی وکفر سے استغناء ظاہر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے کفر ومعاصی سے کچھ ضرر نہیں پہنچ سکتا بلکہ ان کی تو یہ شان ہے ؎

من نکردم خلق تا سودے کنم بلکہ تا بر بندگان جودے کنم (۴)

یہ معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے غنی ہونے کے جو قرآن میں ہیں۔ اور وہ معنی جو مشہور ہیں کفر ہیں کیونکہ سارا قرآن رؤف الرحیم سے بھرا ہوا ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑے مہربان ہیں۔

---

(۱) اللہ کی محبت اور عظمت اس کے احکام کی علت معلوم کرنے اور اس کے علم کے انتظار کرنے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے (۲) ''اور جو شخص محنت کرتا ہے وہ اپنے ہی لئے محنت کرتا ہے خدا تعالیٰ کو تمام جہاں والوں میں سے کسی کی حاجت نہیں'' سورۂ عنکبوت:۶ (۳) ''اگر تم کفر کروگے تو خدا تعالیٰ تمہارا حاجت مند نہیں اور وہ اپنے بندوں کے لئے کفر کو پسند نہیں کرتا'' سورۂ زمر:۷ (۴) ''میں نے مخلوق کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ اُن سے کچھ فائدہ حاصل کروں بلکہ اسی لئے پیدا کہ اُن پر جود وکرم کروں''۔

رعایتِ ادب

غرض آج کل اللہ کے ساتھ لوگ بہت بے ادبی کرتے ہیں۔ کوئی ''یا وارث'' کا وظیفہ پڑھتا ہے کوئی ''یا امداد اللہ'' لکھتا ہے۔ مقربین کو تو ذرا سی بات پر گوشمالی کی جاتی ہے۔ ہمارا جہل ہمارے کام آ گیا ہے۔ ہم سے ان باتوں پر گرفت نہیں ہوتی یا کم ہوتی ہے۔ ایک بزرگ کا واقعہ میں نے دیکھا ہے کہ کسی چیز کی نسبت ان کی زبان سے یہ نکل گیا تھا کہ بہت لطیف ہے اس پر ان سے مواخذہ ہوا کہ او بے ادب لطیف ہمارا نام ہے دوسرے پر اس کو کیوں جاری کیا؟ مجھے خوب یاد ہے کہ جب سے یہ حکایت دیکھی تھی برسوں کسی چیز کو میں نے لطیف نہیں کہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو روزمرہ کے الفاظ میں بھی ادب کی تعلیم دی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ ((خبثت نفسی)) نہ کہو۔ کیونکہ مسلمان کبھی خبیث نہیں ہوتا اور اپنی باندی غلام کو ((عبدی امتی))(۱) نہ کہو بلکہ ((فتائی فتائی)) کہو(۲) غرض ادب بہت بڑی چیز ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

بے ادب را اندریں رہ بار نیست جائے او برد ارشد در دار نیست(۳)

اور فرماتے ہیں ؎

ہر کہ گستاخی کند اندر طریق باشد او در لجہ حیرت غریق(۴)

طریق باطن میں سب سے زیادہ ادب کا اہتمام ہے کیونکہ اہل باطن خاص قرب کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اس طریق میں ادب سے بہت نعمتیں ملتی ہیں اور بے ادبی سے نعمتیں سلب ہو جاتی ہیں(۵)۔

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ

---

(۱) میرا بندہ میری بندی مت کہو (۲) میرا خادم میری خادمہ وغیرہ کہو (۳) ''بے ادب کے لئے اس راہ میں کچھ حصہ نہیں اس کا مقام دار پر ہے نہ کہ دربار میں ہے'' (۴) ''جو شخص راہ طریق میں گستاخی کرتا ہے حیرت کے گڑھے میں غریق رہتا ہے'' (۵) نعمتیں چھین لی جاتی ہیں۔

کے بے نظیر علوم کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مولانا میں اَدب بہت تھا جب طریق باطن میں شیوخ و معلّمین کا اس قدر ادب لازم ہے تو اللہ تعالیٰ کا ادب کیوں لازم نہ ہوگا، دوسرے یاد رکھو کہ بزرگوں کے نام کا وظیفہ پڑھنا خدا تعالیٰ کو تو ناراض کرنا ہی ہے خود بزرگ بھی اس سے ناراض ہوتے ہیں جیسے کوئی شخص چیف ریڈر کو کلکٹر کے سامنے کلکٹر کہنے لگے تو خود چیف ریڈر بھی اس سے ناراض ہوگا۔

حقیقتِ توسل

تو ممکن ہے علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں توسل کی کوئی ایسی صورت ہو جیسے لوگ پیروں اور بزرگوں کے نام کا وظیفہ پڑھتے ہیں اس لئے قصداً تو انہوں نے اس توسل خاص کو منع کرنا چاہا مگر انتظام عام کی وجہ سے مطلقاً توسل کو منع کر دیا۔ جیسے ہم لوگ آج کل رہن کو منع کرتے ہیں کیونکہ عادت عام یہ ہے کہ رہن بدون شرط انتفاع کے نہیں ہوتا(۱) اور یہ صورت حرام ہے، یہ تاویل ہے ان کے قول کی اور تاویل کی ضرورت اس لئے ہے کہ وہ بڑے آدمی ہیں بعض علماء نے اُن کو مجتہد تک کہا ہے ورنہ درحقیقت توسل کی وہ صورت جو میں نے بیان کی ہے حرام نہیں ہے۔ اگر یہ کہو کہ توسل کی جو حقیقت تم نے بیان کی ہے وہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں پھر اس حقیقت کا قصد کر کے کون توسل کرتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جو بات جائز ہے وہ اس وقت تک جائز رہے گی جب تک ناجائز کا قصد نہ کیا جائے اور یہ ظاہر ہے کہ اہلِ حق جو توسل کرتے ہیں وہ ناجائز معنی کا قصد نہیں کرتے گو جائز معنی کا بھی قصد نہ ہو۔

یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ علی حزیں نے اس فقیر کو جو شجرہ پڑھتا تھا تذکرۃ الاولیاء کہا تھا۔ اور میں نے اس حکایت کو بیان کر کے یہ کہا تھا کہ دیکھئے یہ فقیر شجرہ پڑھتا تھا جس کی حقیقت دعا بالتوسل ہے اور دعا بھی ذکر کی ایک فرد ہے تو ظاہر میں

(۱) رہن میں فائدہ اٹھانے کی شرط نہ ہو تو جائز ہے اور مرہون سے نفع اٹھانے کی شرط ہو تو ناجائز ہے۔

وہ ذاکر تھا مگر حقیقی ذکر اس کو حاصل نہ تھا۔ کیونکہ نماز روزے سے معرّا تھا(۱)۔ اگر وہ حقیقی ذاکر ہوتا تو دوسرے اعمال سے معرّا نہ ہوتا تو اس کا ذکر پوست بادام تھا بادام نہ تھا(۲)۔

ذِکر کی دو قسمیں

پس ذکر کی دو قسمیں ہیں ایک صورت ذکر ایک حقیقت ذکر اور ذکر ہی کیا بلکہ ہر چیز کی دو قسمیں ہیں ایک صورت شے ایک حقیقت شے، آدمی بھی دو قسم کے ہیں ایک صورت کے آدمی دوسرے واقعی آدمی، مولانا رحمۃ اللہ علیہ اسی کو فرماتے ہیں ؎

ایں کہ می بینی خلاف آدم اند — نیستند آدم غلاف آدم اند
گر بصورت آدمی انسان بدے — احمد وبوجہل ہم یکساں بدے
اے بسا ابلیس آدم روئے ہست — پس بہر دستے نباید داودست(۳)

نماز کی بھی دو قسمیں ہیں ایک صورت نماز ایک حقیقت نماز بے وضو کے نماز پڑھی جائے تو وہ صورت نماز ہوگی حقیقی نماز نہ ہوگی۔ جیسے کسی گنوار نے وعظ میں سنا تھا بے وضو کے نماز نہیں ہوتی وہ جواب دیتا ہے ''بارہا کردیم وشد''(۴) اسی طرح مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ سے لوگوں نے ایک مرد وعورت کا رشتہ بیان کرکے ان کے نکاح کے متعلق سوال کیا تھا فرمایا ان کا نکاح نہیں ہوسکتا وہ سائل کہتا ہے ہم نے تو کیا تھا ہوگیا تھا۔ اسی قسم کا واقعہ شاہ سلامت اللہ صاحب

(۱) نماز روزے سے خالی تھا (۲) بادام کا چھلکا تھا بادام نہ تھا (۳) ''یہ شخص جس کو میں نے دیکھا ہے آدم کی حقیقت کے بالکل خلاف ہے اور آدمیت کی حقیقت تو اس میں نہیں ہے بلکہ صرف غلاف ہی ہے اگر آدمی کی شکل کا ہر شخص انسان حقیقی ہوتا تو احمد ﷺ اور ابوجہل یکساں ہوتے اے طالب! کبھی انسان کی شکل میں شیطان ہوتے ہیں پس ہر ایک کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دینا چاہیئے (۴) ہم نے تو بارہا کیا ہوگیا۔

کانپوری کے زمانہ میں ہوا کہ مولانا نے ایک مرد وعورت کے نکاح سے انکار کیا کہ انکا نکاح باہم نہیں ہوسکتا لوگ مصر ہوئے کہ اب تو بارات آگئی ہے جس طرح بھی ہوکر دیجئے دھمکایا کہ پاگل ہوئے ہو میں حرام کو حلال کیسے کردوں؟ اس سوا روپے کا ناس ہو جولوگوں نے ایک مُلّا کو سوا روپیہ دے کر بلایا اور ایجاب وقبول کرالیا۔ پھر مولانا سے کہنے آئے کہ واہ ہم نے تو سنا تھا کہ تم بہت بڑے عالم ہو مگر تم سے ذرا سا کام بھی نہ ہوا جو ہمارے مُلّا نے کردیا ظاہر ہے کہ اس صورت میں حقیقی نکاح تو نہ ہوا ہاں نکاح کی صورت پائی گئی کہ ایجاب وقبول ہوگیا چھوارے بٹ گئے اور مُلّا کو ایک روپیہ چار آنے مل گئے۔ اس سے زائد کچھ نہ ہوا۔

مصیبت کی دو قسمیں

استطراداً ایک بات اس وقت اور ذہن میں آگئی کہ اسی طرح مصیبت کی بھی دو قسمیں ہیں ایک صورتِ مصیبت ایک حقیقتِ مصیبت اس سے ایک سوال کا جواب حاصل ہوجائے گا۔ وہ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ﴾ (۱) کہ تم پر جو مصیبت بھی آتی ہے تمہارے اعمال کی وجہ سے آتی ہے اور ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر بھی حوادث کا نزول ہوا۔ بعض انبیاء کو قتل تک کیا گیا اور موت کو قرآن میں بھی مصیبت کہا گیا ہے: ﴿فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ﴾ نیز غزوۂ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک پر صدمہ آیا سر میں زخم آیا تو کیا نعوذ باللہ حضراتِ انبیاء علیہم السلام سے بھی کوئی گناہ سرزد ہوئے تھے جس کی وجہ سے اُن پر یہ مصائب نازل ہوئے۔

اہل حق کا تو مذہب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں۔ گناہوں سے پاک ہیں حشویہ (۲) نے انبیاء کی قدر نہیں کی وہ ان کو معصوم نہیں مانتے میں کہتا ہوں

(۱) ''اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کیے کاموں سے'' سورۂ شوریٰ: ۳۰ (۲) ایک فرقہ باطلہ ہے۔

حشویہ کا یہ قول نقل کے تو خلاف ہے ہی عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ دنیا کے حکّام بھی جس کے سپرد کوئی عہدہ کرتے ہیں تو انتخاب کر کے اس کو حاکم بناتے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ کے یہاں عہدہ نبوت کے لئے انتخاب نہیں ان کا انتخاب ایسا غلط ہے کہ ایسے اشخاص کو نبوت کا عہدہ دے دیا جاتا ہے کہ اوروں کو تو قانون کا پابند بنادیں اور خود قانون کے خلاف کریں عقل کبھی اس کو باور نہیں کرسکتی۔

بس جواب اشکال کا یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جو کچھ پیش آیا وہ مصیبت نہ تھی بلکہ صورتِ مصیبت تھی اور یہ محض تاویل ہی نہیں بلکہ اس کی ایک دلیل ہے میں آپ کو ایک معیار بتلاتا ہوں جس سے حقیقتِ مصیبت اور صورتِ مصیبت میں فرق معلوم ہوجائے گا وہ یہ کہ جس سے انقباض اور پریشانی بڑھے وہ تو گناہوں کی وجہ سے ہے اور جس سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہو تسلیم و رضا زیادہ ہو وہ حقیقت میں مصیبت نہیں گو صورت اس کی ہو۔ اب ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر خود دیکھ لے کہ مصیبت کے وقت اس کی کیا حالت ہوتی ہے اور اسی معیار کو لے کر حضرات انبیاء واولیاء کے مصائب اور اہل دنیا کے مصائب میں موازنہ کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ حضرات انبیاء واولیاء پر ان واقعات سے یہ اثر ہوتا تھا کہ پہلے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھتا اور رضاء وتسلیم میں ترقی ہوتی تھی اور وہ غایت انقیاد وتفویض سے یوں کہتے تھے۔ (۱)

اے حریفاں راہ ہارا بستہ یار آہوے نیگم واو شیر شکار
غیر تسلیم ورضاء کو چارۂ درکف شیر نرخونخوارہ (۲)

اور یوں کہتے ہیں ؎

(۱) وہ انتہائی تابعداری اور فرمانبرادی سے یہ کہتے (۲) ''اے حریفوں! یار کے تمام راستے بند کردیے ہیں ہم لنگڑے ہرن اور شکار کے ہرن کی طرح ہیں سوائے تسلیم ورضا کے اور کچھ چارہ نہیں کیونکہ شیر نرخونخوارہ کے پنجہ میں ہیں''۔

ناخوش تو خوش بود برجان من دِل فدائے یار دل رنجان من (۱)

کفار کی گمراہی کی وجہ

حشویہ کی حماقت ہے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کو اپنے اوپر اقیاس کرلیا اور کہہ دیا کہ وہ بھی ہم جیسے بشر ہیں (۲)۔ ان سے بھی گناہ ہوجاتے ہیں ان پر بھی مصائب آتے ہیں اور یہ نہ دیکھا کہ ہمارے مصائب اور ان کے مصائب میں کتنا زمین وآسمان کا فرق ہے اس قیاس فاسد (۳) ہی نے مخلوق کو تباہ کیا ہے اور یہی بات ہے جس کی وجہ سے کفار کو ایمان نصیب نہ ہوا کیونکہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کا ظاہر دیکھ کر ان کو اپنے جیسا سمجھا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد کم کسے ز ابدال حق آگاہ شد
گفتہ اینک ما بشر ایشاں بشر ماوایشاں بستۂ خوابیم وخور
ایں ندانستند ایشاں از عمیٰ درمیاں فرقے بود بے منتہا
کارپا کاں را قیاس از خود مگیر گرچہ ماند در نوشتن شَیر و شِیر (۴)

ایک شخص نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے ؎

شَیر آں باشد کہ آدم می خورد شِیر آں باشد کہ آدم می خورد (۵)

---

(۱) میرا دل تو محبوب پر فدا ہے جو ناپسندیدہ بات میرے محبوب کو پسند ہو مجھے وہی پسند ہے (۲) انسان (۳) غلط قیاس (۴) ''یعنی دنیا اسی خام خیالی کی وجہ سے گمراہ ہوگئی کہ انہوں نے اللہ کے اولیاء کو پہچانا نہیں۔ اور کہنے لگے ہم بھی انسان وہ بھی انسان وہ بھی کھاتے پیتے ہیں ہم بھی کھاتے پیتے ہیں۔ ان بے وقوفوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ ان میں ہم میں بڑا فرق ہے۔ بزرگانِ دین اور نیک لوگوں کے کاموں کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو اگرچہ دیکھنے میں تمہارا اور انکا کام یکساں ہو جیسے لکھنے میں شَیر اور شِیر یکساں ہیں'' (۵) ''شَیر وہ (جانور) ہوتا ہے جو آدمیوں کو کھاتا ہے۔ شِیر (دودھ) وہ ہوتا ہے جس کو آدمی کھاتے (پیتے) ہیں''۔

آغوش کی دو قسمیں

صاحبو! آغوش میں لینا دو طرح ہے ایک چور کو پکڑ کر بغل میں دبانا گو دبانے والا حسین و محبوب ہی ہو مگر چور اس دبانے سے خوش نہ ہوگا کیونکہ وہ عاشق نہیں ہے وہ دبانے سے پریشان ہوگا بھاگنا چاہے گا اور ایک آغوش میں لینا یہ ہے کہ محبوب اپنے عاشق کو بغل میں لے کر دبائے اور زور سے دبائے اب تم اس کے دل سے پوچھو کہ وہ کیا کہتا ہے کیا وہ اس تکلیف کی وجہ سے آغوش محبوب سے نکلنا چاہے گا۔ ہرگز نہیں بلکہ یوں کہے گا۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی (۱)

اسی طرح حق تعالیٰ دو طرح کے لوگوں کو دباتے ہیں ایک تو ان کو جو چور ہیں اور ایک ان کو جو اللہ تعالیٰ کے عاشق ہیں چور تو خدا کی بندش سے گھبراتا ہے اور عشاق کی یہ حالت ہے ؎

اسیرش نخواہد رہائی زبند شکارش نجوید خلاص از کمند (۲)

اور یہ حالت ہے کہ ؎

خوشا وقت شوریدگاں غمش اگر تلخ بینند و گر مرہمش
گدایانے از پادشائی نفور بامیدش اندر گدائی صبور
دمادم شراب الم درکشند وگر تلخ بینند دم درکشند (۳)

(۱) ''دشمنوں کے مقدر میں یہ بات نہ ہو کہ وہ تمہاری تلوار سے ہلاک ہو تمہاری تلوار کے لئے ہم دوستوں کا سر حاضر ہے'' (۲) تیرا قیدی تیری قید سے رہائی نہیں چاہتا تیرا شکار تیرے جال سے نکلنا نہیں چاہتا (۳) ''اس کے غم میں پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے خواہ اپنے زخموں پر نظر پڑے یا اس کے زخموں پر مرہم، وہ لوگ تو ایسے فقیر ہیں جن کو بادشاہی سے نفرت ہے اور اس کی امید میں گدائی پر صبر کیے ہیں اگر تلخ دیکھتے ہیں تو خاموش ہو جاتے ہیں''۔

اب آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ایک صورتِ مصیبت ہے ایک حقیقتِ مصیبت ہے۔ حقیقتِ مصیبت تو واقعی گناہوں سے ہی آتی ہے مگر صورتِ مصیبت رفع درجات اور امتحان محبت کے واسطے بھی آتی ہے۔ اسی طرح ذکر کے دو درجے ہیں ایک حقیقتِ ذکر ایک صورتِ ذکر جو وظیفچی (۱) نماز نہیں پڑھتے اُن کو صورت ذکر حاصل ہے۔ حقیقی ذکر حاصل نہیں جیسے مٹی کا ہاتھی بھی نام کا ہاتھی تو ہے مگر کام کا ہاتھی نہیں۔

حکایت

مٹی کے ہاتھی پر اکبر بیربل کی ایک حکایت یاد آئی کہ اکبر نے بیربل سے کہا کہ یہ مشہور ہے کہ تین ہٹیں بہت سخت ہیں۔ راج ہٹ، تریا ہٹ، بالک ہٹ۔ یعنی بادشاہ کی ہٹ، عورت کی ہٹ اور بچوں کی ضد تو ان میں بادشاہ وعورت کی ضد کا سخت ہونا تو مسلّم ہے کیونکہ وہ عاقل ہیں۔ ممکن ہے کوئی ایسی ضد کریں جو پوری نہ ہو سکے۔ مگر بچوں کی ضد کا پورا کرنا کیا مشکل ہے؟ بیربل نے کہا حضور سب سے زیادہ مشکل یہی ہے البتہ عاقل کے لئے آسان ہے۔ اکبر نے کہا یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ بیربل نے کہا اچھا مجھے اجازت دی جائے کہ میں بچہ بنوں اور بچوں کی طرح ضد کروں۔ کہا اچھا اب بیربل رونے لگا اوں اوں اوں، اکبر نے کہا کیا ہے کیوں روتا ہے؟ کہا ہم تو ہاتھی لیں گے۔ اکبر نے فیل خانہ (۲) سے ایک ہاتھی منگا دیا کہ لو! وہ پھر رونے لگا۔ کہا اب کیا چاہتے ہو۔ کہا ہم تو کُلھیا لیں گے (۳) اکبر نے ایک کُلھیا منگا دی۔ وہ پھر رونے لگا کہا اب کیا چاہتے ہو؟ کہا اس

(۱) وظیفے پڑھنے والے (۲) ہاتھی گھر (۳) چھوٹی سی ہنڈیا یعنی دیگچی۔

ہاتھی کو کُلھیا میں رکھ دو۔ اب تو اکبر بڑا گھبرایا کہ یہ ضد کیونکر پوری ہو۔ کہا واقعی میں سمجھ گیا کہ بال ہٹ (۱) بہت سخت ہے۔ مگر تم نے جو کہا تھا کہ عاقل کو آسان ہے تو عاقل یہاں کیا عقل چلائے گا۔ بیربل نے کہا حضور عاقل کو واقعی آسان ہے۔ اکبر نے کہا اچھا اب ہم بچہ بنتے ہیں تم ہماری ضد پوری کرو۔ چنانچہ اکبر نے بھی یہی سبق دُہرایا کیونکہ ان کو تو ایک ہی سبق یاد تھا پھر جب اکبر نے ہاتھی مانگا تو بیربل نے بازار سے مٹی کا ننہا سا ہاتھی منگا دیا جب کُلھیا مانگی تو بڑی سی کُلھیا منگا دی جب ہاتھی کو کُلھیا میں رکھنے کو کہا اس نے آسانی سے رکھ دیا۔ اور کہا حضور آپ نے جو بچہ کی ضد پر فیل خانہ سے ہاتھی منگایا یہ غلطی تھی۔ بچوں کے لئے انہی کے مذاق کا ہاتھی منگانا چاہیئے، غرض مٹی کا ہاتھی بھی بچوں کے نزدیک ہاتھی ہے نام اس کا بھی ہاتھی ہے۔ مگر حقیقت میں ہاتھی نہیں ہے۔ اسی طرح ذکر میں دو درجے ہیں۔ جو ذکر حقیقی ہے وہ اور ہے اور صورتِ ذکر اور ہے۔ ذکر حقیقی سارے معاصی سے بچنے کو اور تمام اوامر کے بجالانے کو مستلزم ہے (۲) اور وہ بہت سہل و مختصر ہے۔

لفظ ''اَحَدی'' کی تحقیق اور حکایت

مگر آجکل ہم لوگ واجد علی شاہ کے زمانہ کے اَحَدی ہوگئے ہیں۔ (نہ معلوم یہ کیا لفظ ہے میرا خیال یہ ہے کہ یہ اَحَدی ہے چونکہ یہ لوگ جانثار ہوتے تھے۔ ان کا تعلق صرف ایک ذات سے تھا اس لئے ان کو اَحَدی کہا گیا۔ (۳) پھر چونکہ ان کا کام اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ جب ضرورت ہو تو بادشاہ کی جان کی حفاظت کریں اور ایسا موقع شاذ و نادر (۴) پیش آتا تھا ورنہ تنخواہ لے کر

(۱) بچے کی ضد (۲) تمام گناہوں سے بچنے اور تمام احکامات کو بجالانے کا نام ہے (۳) یعنی ایک ہی ذات سے تعلق رکھنے والا (۴) کبھی کبھی۔

مزے کرتے تھے اس واسطے یہ لوگ سست اور کاہل رہا کرتے تھے) ان اَحَدیوں کی ایک حکایت مشہور ہے کہ دو اَحَدی ایک جگہ رہتے تھے۔ دونوں میں باہم یہ عہد ہوا تھا[1] کہ ایک دن ایک لیٹا رہے دوسرا اس کی حفاظت کرے دوسرے دن دوسرا لیٹا رہے پہلا اس کی خدمت کرے۔ ایک دن ایک لیٹا ہوا تھا ایک سوار پاس سے گزرا اس نے آواز دی میاں سوار ذرا یہاں آنا اس نے پاس آکر کہا کیا ہے؟ کہا میرے سینے پر جو بیر رکھا ہے۔ یہ ذرا میرے منہ میں ڈال دے۔ سوار نے کہا کمبخت میں گھوڑے سے اُتروں اور ڈالوں تو خود اپنے ہاتھ سے کیوں نہیں ڈال لیتا! کہا اجی اب ہاتھ کون ہلائے اور منہ تک اُسے کون لے جائے۔ سوار نے اس کے ساتھی سے جو بیٹھا ہوا تھا کہا کہ تو ہی اس کے منہ میں ڈال دے وہ جھلا کر کہتا ہے کہ جناب مجھ سے ایسی بات نہ کہئے گا آپ کو واقعہ معلوم نہیں کل میرے لیٹنے کی باری تھی یہ بیٹھا ہوا تھا میں نے جمائی لی اس وقت ایک کتا میرے منہ میں پیشاب کر گیا۔ اس کمبخت نے اُس کو ہٹایا تک نہیں اب میں اس کو ضرور بیر کھلاؤں گا، سوار نے دونوں پر لعنت بھیجی اور چل دیا، تو جیسے ان بے وقوفوں نے اپنی کاہلی سے ایک آسان کام کو مشکل بنالیا تھا۔ ایسے ہی ہم لوگوں نے بھی آسان کو مشکل بنا رکھا ہے۔

ذِکر کے بارے میں لوگوں کی غلط فہمی

ہم لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ذاکر وہ ہے جو بیوی بچوں کو چھوڑ دے۔ اچھے سامان کو راحت کے اسباب کو چھوڑ دے یہ بالکل غلط ہے۔

---

(۱) آپس میں معاہدہ تھا۔

دین و دنیا کا اجتماع

البتہ غیر ضروری کام کے لئے اہتمام وفکر کرنا یہ بیشک بُرا ہے کیونکہ خدا سے غافل کرنے والا ہے اور اگر بدون اہتمام کے حاصل ہوتو ہ بُرا نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک خواب کے بارے میں فرمایا ہے: کہ میں نے اپنی امت کی ایک جماعت کو دریا میں سفر کرتا ہوا جہاد کے لئے دیکھا وہ ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے بادشاہ تخت پر بیٹھے ہوں یعنی شاہانہ ساز وسامان کے ساتھ جارہے ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی فضیلت بھی بیان فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ وہ شاہانہ سامان کے ساتھ ہوں گے معلوم ہوا کہ شان وشوکت کا سامان مطلقاً مذموم نہیں۔ اور جن بزرگوں نے سلطنت ترک کردی ہے یہ ان کا غلبہ حال تھا ورنہ حضرات صحابہ کی یہ حالت تھی کہ انہوں نے دنیا ودین کو جمع کر کے دکھلا دیا اور ان کی یہ شان تھی ((رهبان اللَّيْلِ لُيُوث النهار)) رات کو عابد زاہد تھے دن کو بہادر شیر تھے۔

اہل اللہ کی شان

حضرت سلطان نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں شاہانہ ساز وسامان تھا مگر اہتمام سے جمع نہ ہوا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ بھیجتے تھے۔ اس لئے جمع ہوگیا تھا۔ چنانچہ آپ کے یہاں وزراء اور سلاطین بھی بعض دفعہ دسترخوان پر حاضر ہوتے تھے اور سب کو ان کے مذاق کے موافق کھانا ملتا تھا۔ ایک بار وزیر حاضر تھا کھانے کا وقت آگیا۔ خادم نے اطلاع کی کہ کھانا تیار ہے، وزیر صاحب کے دل میں مچھلی کے کباب کا خیال آیا کہ اس وقت مچھلی کے کباب بھی ہوں تو اچھا ہے سلطان جی کو

اس خطرہ کا کشف ہوگیا(۱) خادم سے فرمایا ذرا ٹھہرو، اسی لئے تو بزرگوں کے پاس جا کر دل کی نگہداشت کرنی چاہیئے کیونکہ بعض کو کشف ہوجاتا ہے اور کسی کو کشف نہ بھی ہو جب بھی ادب کی بات یہ ہے کہ ان کے پاس دل کو خطرات (۲) سے خالی کر کے جائے کیونکہ ادب تو علم وعدم علم پر موقوف نہیں (۳) کیا باپ کا ادب سامنے ہی کرتے ہو پیچھے نہیں کرتے، غرض سلطان جی کو کشف ہوگیا اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ کہیں سے مچھلی کے کباب بھیج دیجئے ذرا دیر کے بعد خادم پھر آیا کہ حضرت کھانا تیار ہے۔ فرمایا ذرا ٹھہرو تھوڑی دیر کے بعد پھر آیا کہ کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے۔ فرمایا ذرا اور ٹھہرو اتنے میں ایک شخص سر پر خوان لئے ہوئے حاضر ہوا کہ حضور کو فلاں امیر نے سلام عرض کیا ہے اور حضرت کے لئے مچھلی کے کباب بھیجے ہیں۔ حضرت نے ہدیہ قبول فرمایا اور خادم کو حکم دیا کہ کھانا لے آؤ۔ وزیر صاحب کو یہ بھی احتمال ہوا کہ شاید میری فرمائش ہی کی وجہ سے کھانے میں دیر کی گئی اور کباب کا انتظار کیا گیا تھا۔ اور یہ بھی احتمال ہوا کہ شاید اتفاق ہو خادم نے دسترخوان بچھا کر سب کے سامنے کھانا رکھنا شروع کیا تو سلطان جی نے فرمایا کہ مچھلی کے کباب وزیر صاحب کے سامنے زیادہ رکھنا ان کو اس کا بہت شوق ہے۔ اب وزیر صاحب سمجھے پھر سلطان جی نے فرمایا کہ وزیر صاحب فرمائش کا تو مضائقہ نہیں مگر ذرا گنجائش رکھ کر فرمائش کرنی چاہیئے دیکھئے اس وقت دیر ہونے سے سب کو تکلیف ہوئی اب تو وزیر کو یقین ہوگیا کہ حضرت کو میرے خطرہ کا کشف ہوگیا تھا۔

غرضیکہ اہل اللہ میں ایسے بھی ہوئے ہیں جنہوں نے دنیا کے ساز وسامان کے ساتھ دین میں ترقی حاصل کی ہے۔

(۱) سلطان جی کو اسکے دل میں آنے والی بات سے اللہ تعالی نے بذریعہ کشف آگاہ کردیا (۲) خیالات (۳) ادب علم ہونے یا نہ ہونے پر منحصر نہیں۔

خواجہ عبیداللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کا مقام بلند

حضرت خواجہ عبیداللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ بھی ایسے ہی بزرگ ہیں۔ جن کے یہاں بہت کچھ ساز و سامان تھا۔ مگر اہل طریق اُن کے کمال سے واقف تھے اور اپنے زمانہ میں وہ مشہور بزرگ تھے چنانچہ مولانا جامی بھی شہرت سن کر آپ کے پاس حاضر ہوئے تھے مگر مولانا جامی کے مذاق پر فقر کا غلبہ تھا۔ وہ اہلِ باطن کے لئے باطنی فقر کے ساتھ ظاہری فقر کو بھی ضروری سمجھتے تھے خواجہ صاحب کا ساز و سامان اور شان و شوکت دیکھ کر مکدر ہوئے (۱) اور جوش میں یہ کہہ ڈالا ؎

نہ مردست آنکہ دنیا دوست دارد (۲)

اور خفا ہوکر مسجد میں چلے گئے۔ حق تعالیٰ کو ان کی دستگیری مطلوب تھی (۳)۔ اس لئے مسجد میں جو سوئے تو خواب دیکھا کہ میدان قیامت قائم ہے۔ اور ایک شخص مولانا جامی کے سر ہو رہا ہے کہ تمہارے ذمہ میرے چند پیسے ہیں۔ ادا کرو ورنہ نیکیاں دو۔ یہ بڑے پریشان ہوئے پھر دیکھا کہ خواجہ عبیداللہ احرار کی سواری آرہی ہے۔ وہ اُن کے پاس پہنچ کر رکے اور اس شخص سے فرمایا۔ کہ فقیر کے کیوں سر ہو رہا ہے میرا مہمان ہے، اُس نے اپنے حق کا ذکر کیا۔ فرمایا ہم نے جو خزانے یہاں جمع کر رکھے ہیں ان میں سے اپنا حق لے لو، مولانا جامی یہ خواب دیکھ کر بیدار ہوئے تو نماز ظہر کا وقت تھا اور خواجہ صاحب مسجد میں داخل ہو رہے تھے اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ یہ شخص دنیا دار نہیں بلکہ مقبول بارگاہ ہے۔ دوڑ کر خواجہ صاحب کے قدموں میں گر پڑے اور خطرہ کی معافی مانگی اور خدمت میں قبول کرنے کی درخواست کی۔ خواجہ صاحب نے تسلی کی کہ اچھا جو چاہو گے ہو جائے گا

(۱) دل بُرا ہوا (۲) وہ مرد حق شناس نہیں جو دنیا کو محبوب رکھے (۳) اللہ تعالیٰ کو ان کی اصلاح مقصود تھی۔

مگر ذرا اپنا وہ مصرع تو پھر سنا دو مولانا نے عرض کیا کہ وہ تو میری حماقت تھی فرمایا ایک بار تم نے اپنی خوشی سے پڑھا تھا اب ہمارے کہنے سے پڑھ دو۔ انہوں نے حسب ارشاد سنایا ؎

نہ مردست آنکہ دنیا دوست دارد

خواجہ صاحب نے فرمایا صحیح مضمون ہے مگر محتاجِ اتمام ہے اس لئے اس میں یہ اور ملادو کہ ؎

اگر دارد برائے دوست دارد (۱)

محبت کا ایک رنگ

صاحبو! محبت کا ایک رنگ یہ ہے کہ اپنی طرف سے تو محبوب کے سوا سب کو چھوڑ کر اسی کے مشاہدہ میں لگا رہے لیکن اگر خود محبوب ہم کو حاکم بنادے تو حکومت کے انتظام میں مشغول ہونا یہ بھی عین مشاہدہ ہے یہ شخص اس حالت میں بھی ذاکر اور صاحب مشاہدہ ہے۔

محبتِ حق کی پہچان

اب یہ بات باقی رہی کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم اپنے نفس کو خوش کرنے کے واسطے انتظام کر رہے ہیں یا محض محبوب کی وجہ سے تو اس کا معیار یہ ہے کہ یہ شخص اُن محکومین کو اپنے سے کم نہ سمجھے گو کام تو کرے بڑا ہو کر مگر اعتقاد میں سب کو اپنے سے بڑا سمجھے تو یہ اس کی علامت ہوگی کہ یہ محض محبوب کے حکم کی وجہ سے سیاست خلق میں مشغول ہے نفس کے لئے کام نہیں کر رہا۔ چنانچہ اہل اللہ کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو سزا بھی دیتے ہیں اور عین اس حالت میں اپنی

(۱) اگر دنیا کو محبوب رکھے تو دوست (اللہ) کی خاطر محبوب رکھے۔

سیاست کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے بادشاہ نے بھنگی کو حکم دیا ہوا ہو کہ شہزادے کے سو کوڑے مارو تو وہ حکم شاہی کی تعمیل ضرور کرے گا۔ مگر شہزادے سے افضل ہونے کا اسے وسوسہ بھی نہ آئیگا۔

انتخاب پیر میں لوگوں کی غلط فہمی

بہرحال لوگ ذاکر اسی کو سمجھتے ہیں جو تمام تعلقات ترک کردے چنانچہ بعض جاہل پیر فخر کرتے ہیں کہ ہمارے مرید نے بیس برس سے بیوی سے بات نہیں کی۔

ایک بار میں اپنی گھر والی کو علاج کے لئے میرٹھ لے گیا وہاں ایک مسماۃ نے بیعت کی درخواست کی تو دوسری بعض مستورات نے اس کو منع کیا کہ ان سے مرید نہ ہو یہ تو بیوی کو ساتھ ساتھ لئے پھرتے ہیں ہمارے پیر سے بیعت ہونا انہوں نے پچاس برس سے بیوی سے بات تک نہیں کی مگر اس اللہ کی بندی نے التفات بھی نہ کیا گویا زبان حال سے یہ جواب دیا کہ تم مجھے ایسے شخص سے بیعت ہونے کی ترغیب دیتی ہو جس نے پچاس برس سے خدا تعالیٰ کو ناراض کر رکھا ہے۔ میں اُس سے ہرگز بیعت نہ ہوں گی۔

اہل وعیال سے برتاؤ

صاحبو! یہ جو مشہور ہے ؎

آنکس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند فرزند و عزیز و خانماں راچہ کند (۱)

کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اہل وعیال کے حقوق ضائع کردو بلکہ معنی یہ ہیں کہ اُس کو اہل وعیال کی محبت خدا تعالیٰ سے غافل نہ کرسکے ورنہ جو شخص خدا کو پہچانے گا وہ خدا کے احکام کو ضرور پہچانے گا۔ اور خدا تعالیٰ کا حکم ہے کہ اہل وعیال کے حقوق

(۱) جس نے تجھے پہچان لیا اپنی جان کی کیا پرواہ کریگا بیوی بچے اعزہ اس کو تیری یاد سے غافل نہیں کرسکتے۔

ادا کرو مگر نہ اس حیثیت سے کہ وہ چیزیں تمہاری ہیں۔ بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ اللہ کی چیزیں ہیں چنانچہ وارد ہے: ((الخلق عیال اللّٰہ)) اور جس کے متعلق خدا تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ: ((احبکم الی اللّٰہ احسنکم الی عیالہ)) اوکما قال یعنی خدا کے نزدیک زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کی عیال سے اچھا برتاؤ کرے یعنی مخلوق سے خصوصاً اس مخلوق سے جس کی نگہداشت (۱) اس کے ذمہ ضروری ہے۔

لوگوں کی غلط فہمی کی مثال

مگر لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ ذاکر شاغل وہ ہے جو سب تعلقات کو ترک کردے اور مکان گرادے مگر اس کے گرانے سے کیا نتیجہ ہوگا پس وہ نتیجہ ہوگا جیسے ایک شخص نے روپیہ قرض لے کر مکان بنایا تھا۔ ایک تو یہ حماقت کی پھر جب قرض خواہ نے تقاضا زائد کیا تو آپ نے غصہ میں آکر مکان ہی گرادیا کہ جاؤ ہم وہ مکان ہی نہیں رکھتے جو تمہاری رقم سے بنایا تھا اس حرکت سے قرض تو بجنسہ باقی (۲) رہا ہاں ایک نقصان اور ہوگیا کہ مکان بھی نہ رہا اس کی وہی حالت ہوگئی جیسے ایک افیونی کی ناک پر مکھی بار بار بیٹھتی تھی وہ اُراتا تھا اور وہ پھر آکر بیٹھ جاتی بعض مکھیاں لیچڑ ہوتی ہیں کہ تنگ کردیتی ہیں۔ افیونی نے کیا تدبیر کی کہ استرہ لے کر ناک ہی کاٹ ڈالی کہ جاؤ ہم نے اڈا ہی نہیں رکھا اب کہاں بیٹھے گی۔ مگر مکھی کے لئے اب پہلے سے اچھا اڈا مل گیا۔ کیونکہ خون چوسنے کو ملا اور شاید اب پہلے سے زیادہ مکھیوں کا لشکر جمع ہوگیا ہو مگر میاں کی ناک نہ رہی۔ یہی حالت ان ذاکروں کی ہے کہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر خدا تو ان سے نہ ملا ہاں یہ نقصان مزید ہوا کہ اپنی دنیا بھی بے حلاوت کرلی (۳) اور پریشانی بڑھالی۔

(۱) دیکھ بھال (۲) قرض تو پورا کا پورا اس کے ذمہ رہا (۳) بدمزہ کرلی۔

ذکر کی حقیقت

اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ذکر کو آسان کردوں اور لوگوں کو ذکر اللہ کی حقیقت بتلادوں۔ لوگ سوا لاکھ مرتبہ اللہ اللہ کرنے کو ذکر اللہ سمجھتے ہیں مگر یہ بھی حقیقت ذکر نہیں بلکہ صورت ذکر ہے اور ذکر کے آثار سے ہے۔ ورنہ اگر اس کو حقیقت ذکر حاصل ہوتی تو یہ شخص دوسرے اعمال کا تارک نہ ہوسکتا حالانکہ بعضے سوا لاکھ دفعہ اللہ اللہ کرنے والے بھی دوسرے اعمال سے معرّا ہیں (۱) اس لئے میں ذکر کی حقیقت بتلاتا ہوں۔

اس کو ایک مقدمہ سے سمجھئے وہ یہ کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض مرتبہ شریف آدمی کے دل میں بھی جرائم کا تقاضا ہوتا ہے جیسے چوری وغیرہ چنانچہ بعضے شریف آدمی بھی چوری کرنے لگتے ہیں محض اس وجہ سے کی طبیعت کا تقاضا ہے اور یہ تقاضا اس وجہ سے نہیں کہ اُن کا پیشہ چوری کرنا ہے بلکہ محض احتیاج کی وجہ سے کیونکہ احتیاج بُری بلا ہے یہ انسان کو بُری سے بُری جگہ لے جاتی ہے ایک تو یہ منظر آپ کے سامنے ہے اس کو ذہن میں رکھئے، اب اس کے مقابل دوسری جماعت کو دیکھئے کہ باوجود تقاضا وافلاس کے چوری نہیں کرتے بلکہ چوری تو کیا کرتے سرکاری مال گذاری کو بھی نہیں ٹالتے بلکہ اپنی زمین اور جانور بیچ کر مال گذاری ادا کرتے ہیں گو گھر میں فاقہ ہوجائے، اس میں غور کیجئے کہ پہلی جماعت چوری پر کیونکر اقدام کرتی ہے اور دوسری جماعت مال گذاری تک کیوں ادا کرتی ہے حالانکہ افلاس و احتیاج میں دونوں برابر ہیں۔ وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ ان کو ایک چیز یاد آئی ہے جو پہلی جماعت کو یاد نہیں آئی یعنی سزا اور قید وغیرہ

(۱) دوسرے اعمال سے خالی ہیں۔

کی رسوائی اور بس، اب سمجھو کہ ذکر کی حقیقت بھی یہی ہے اور یاد بھی اسی کو کہتے ہیں محض علم کا نام یاد نہیں ہے کیونکہ چوری پر سزا ہے قید اور سزائے تازیانہ کا مرتب ہونا پہلی جماعت کو بھی معلوم تھا(۱) مگر یہ سزا و قید ان کے پیش نظر اور مستحضر نہ تھی (۲) اس لئے وہ جرائم سے نہ رک سکے اور یہ بات دوسری جماعت کے پیش نظر تھی اور پوری طرح مستحضر تھی اس لئے وہ اقدام نہ کر سکی۔

اشکال کا جواب

اس پر شاید یہ سوال ہوگا کہ اس تقریر کا حاصل تو یہ ہوا کہ جنت اور دوزخ کی یاد کا نام ذکر اللہ ہے حالانکہ یہ تو ذکر جنت و نار ہوا۔ (۳) اللہ کی یاد تو نہ ہوئی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ثواب کی یاد اور عذاب کی یاد اللہ ہی کی یاد ہے جیسے کہا جاتا ہے۔ کہ قانون کو یاد کرو اس کا یہی مطلب ہے۔ کہ قانون کا یاد کرنا ہی ہتھکڑی اور جیل کا یاد کرنا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ذکر اللہ کے مراتب ہیں۔ بعض کو محض ذات حاکم کی یاد کافی ہوتی ہے۔ ان کو جرائم سے بچنے کے لئے سزائے جیل وغیرہ کی یاد کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ بعض کو حاکم یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ تم جو چاہو کرو تم کو سزا نہ ہوگی پھر بھی اس کو حاکم سے ایسا خاص تعلق ہوتا ہے کہ مخالفت نہیں کر سکتا پھر بعض تو ایسے وقت میں ناراضگی کے اندیشہ سے مخالفت نہیں کرتے اور بعض کو یہ اندیشہ بھی نہیں ہوتا بلکہ حیا و شرم مانع ہوتی ہے اور بعض کو یہ مانع بھی نہیں ہوتا یعنی حیا و شرم پر بھی التفات نہیں ہوتا اس تعلق کا نام کچھ نہیں ۔

(۱) چوری کرنے پر سزا و قید وغیرہ ہونے کا علم پہلی جماعت کو بھی تھا (۲) لیکن قید و سزا کا ان کو یقین نہ تھا
(۳) جنت اور جہنم کا ذکر ہوا۔

خوبی ہمیں کرشمہ و نازو خرام نیست بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست(۱)

اس کا نام اگر کچھ ہے تو تعلق ذات ہے۔ بہر حال مراتب ذکر میں تدریج ضروری ہے اب ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ ہم کو اللہ تعالیٰ سے تعلق کس قسم کا ہے جیسا تعلق ہو اُسی کے مناسب ذکر میں مشغول ہونا چاہیئے اور یہ فرق مراتب ہی تو ہے جس کی وجہ سے حق تعالیٰ نے ذکر کی تاکید فرماتے ہوئے کہیں تو ذکر کو اپنی ذات سے متعلق کیا ہے جیسے: ((وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ)) میں اور کہیں اسماء حسنی سے متعلق فرمایا ہے جیسے: ﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلاً﴾(۲) میں یہاں مفسرین نے لفظ اسم کو مقحم کہا ہے مگر میں کہتا ہوں کہ زائد کہنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ تغیر عنوان مراتب ذاکرین کے اعتبار سے ہے۔ اور یہ تفسیر بالرائے نہیں ہے کیونکہ یہ نہ قواعد عربیہ کے خلاف نہ قواعد شرعیہ کے خلاف پھر میں اس کو جزم(۳) کے ساتھ نہیں بیان کرتا بلکہ احتمال کے طور پر کہہ رہا ہوں مولانا ذکر کے اسی فرق مراتب پر تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

مست ولا یعقل نہ از جام ہو اے زہو قانع شدہ برنام ہو(۴)

ذکر لسانی کا فائدہ

اس میں تنبیہ ہے کہ ذکر کا ایک درجہ وہ ہے جو ذکر اسمی سے ارفع واعلیٰ ہے(۵) مگر دوسری جگہ بتلاتے ہیں کہ ذکر اسمی بھی بیکار نہیں بلکہ نافع ومفید ہے جس کو پہلا درجہ حاصل نہ ہو وہ اسی کو غنیمت سمجھے کیونکہ ؎

(۱) میرے محبوب میں ناز نخرے اگر چہ نہیں ہے لیکن اس میں کتنی ہی ایسی خوبیاں ہیں کہ جن کا کوئی نام نہیں ہے (۲) ''اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے قطع کر کے اُسی کی طرف متوجہ رہو'' سورۂ مزمل:۸ (۳) پختگی (۴) ''اس کے جام سے مست اور مجنون نہ ہو بلکہ اس کے نام پر قانع ہو جا (۵) اللہ کے نام کے ذکر سے بڑا درجہ ہے۔

از صفت وزنام چہ زاید خیال واں خیالش ہست دلال وصال(۱)

نام یاد کرنے پر ایک حکایت مجنوں کی یاد آئی جو کسی نے مثنوی کے وزن پر لکھی ہے۔ مثنوی کے اشعار نہیں ہیں مگر اچھے اشعار ہیں ؎

دید مجنوں را یکے صحرا نورد دربیاباں غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود و انگشتان قلم می نویسد بہر کسے نامہ رقم
گفت اے مجنونِ شیدا چیست ایں می نویس نامہ بہر کیست ایں
گفت مشق نام لیلیٰ می کنم خاطر خود را تسلی می دہم (۲)

یہاں سے سمجھ میں آجائے گا کہ ذکر لسانی بھی بے کار نہیں گو دل متوجہ نہ ہو اور یہ جو کسی نے کہا ہے ؎

برزباں تسبیح ودر دل گاؤ خر ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر (۳)

یہ غلط ہے میں نے اس کے رد میں کہا ہے ؎

ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر (۴)

صاحبو! غضب ہے کہ کھٹائی اور مٹھائی کے تو نام میں اثر ہو کہ نام لینے سے منہ میں پانی بھر آئے اور خدا کے نام میں اثر نہ ہو۔

احسن تدبیر

کھٹائی کے نام کی اس تاثیر سے دیوبند کے ایک ہندو شاہی طبیب نے

(۱) اللہ کا نام لینے اور اس کی صفات کو ذکر کرنے سے ہی اس کی ذات تک پہنچا جاسکتا ہے (۲) مجنوں کو صحراء میں بیٹھا دیکھا کہ غم کے صحراء میں، اکیلا گم صم بیٹھا تھا ریت کو بطور کاغذ اور انگلی کو بطور قلم استعمال کر کے کسی کو خط لکھ رہا تھا۔ پوچھا کہ اے مجنوں یہ کیا ہو رہا ہے کس کو خط لکھ رہے ہو؟ کہنے لگا کہ لیلیٰ کا نام لکھ کر اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں (۳) زبان سے تو تسبیح پڑھ رہے ہو اور دل میں گناہ کے خیالات میں ایسی تسبیح کیا اثر کریگی (۴) ایسی تسبیح بھی اثر رکھتی ہے۔

بڑا کام لیا۔ وہ یہ کہ شاہ دہلی کے شہزادہ نے روزہ رکھا تھا۔ روزہ کشائی کی تقریب بڑی دھوم سے کی جارہی تھی کہ عصر کے وقت لڑکا پیاس سے بیتاب ہوگیا اور کہنے لگا میں تو روزہ توڑتا ہوں سب کوفکر ہوئی کہ ایسی کیا تدبیر ہو کہ روزہ بھی رہے اور بچہ کو تکلیف بھی نہ رہے۔ اطباء کو جمع کیا گیا اور اس سے معلوم ہوا کہ بادشاہ دیندار تھا گو دنیادار تھا۔ اگر آج کل کے نئی روشنی والوں کی طرح بے دین ہوتا تو کہہ دیتا کہ روزہ توڑ دو روزہ میں کیا رکھا ہے۔ مگر اُس نے روزہ کا احترام کیا غرض اطباء نے تدبیریں سوچیں کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا یہ ہندو طبیب بھی حاضر تھا۔ اس نے کہا ایک تدبیر میری سمجھ میں آئی ہے اگر اجازت ہو تو عرض کروں۔ اس کو اجازت دی گئی تو اس نے کہا کہ جلدی کچھ لیموں منگوائے جائیں اور بچوں سے کہا جائے کہ اس کے سامنے تراش کر چاٹیں اور چٹخارہ لیتے جائیں چنانچہ ایسا ہی ہوا اور شہزادے کے منہ میں لعاب کا دریا بہنے لگا۔ اب طبیب نے کہا کہ میں نے علماء سے سنا ہے کہ لعاب نگلنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔ شہزادہ اس لعاب کو نگلتا رہے پیاس بجھ جائے گی، علماء نے اتفاق کیا اور اس طرح شہزادے کا روزہ پورا ہوگیا۔

علماء کی صحبت کا فائدہ

ہندوؤں کو بھی اُس زمانہ میں علماء کے اختلاط سے بہت مسائل معلوم ہوجاتے تھے میں نے ریاست بھوپال کا قصہ سنا ہے۔ کہ ایک شخص کسی ہندو صراف کی دوکان پر روپوں سے چاندی خرید رہا تھا۔ اس نے اس کو بتلایا کہ اس طرح بیع و شراء تمہارے مذہب میں جائز نہیں روپوں کے ساتھ کچھ پیسے ملا کر خریدو۔ یہاں ہمارے قصبہ میں گھینشی سنار تھا اس کو بہت مسائل اس قسم کے یاد ہوگئے تھے کیونکہ میں اُس سے زیور بنوایا کرتا تھا وہ میرے ساتھ ان مسائل کی رعایت کرتا تھا۔

اللہ کے نام کا فائدہ

تو نام بھی بیکار نہیں بعض دفعہ نام ہی سے کام بن جاتا ہے بلکہ بعض دفعہ بھولے سے کسی نے اللہ کا نام لیا اور مقبول ہوگیا۔ ایک بت پرست کئی سال تک صنم صنم کرتا رہا۔ ایک دن بھولے سے صنم کی جگہ صمد زبان سے نکل گیا فوراً آواز آئی ''لبیك یـــا عبـدی لبیك '' میرے بندے میں موجود ہوں اس آواز سے بت پرست پر وجد طاری ہوگیا اور فوراً بت کے ایک لات رسید کی کہ کمبخت اتنے سال تک تجھے پکارا مگر تو نے پھوٹے منہ سے کبھی جواب تک نہ دیا۔ قربان جاؤں میں اُس خدا کے جس کا نام بھولے سے ایک دفعہ لے لیا تو فوراً میری طرف نظر فرمائی۔

اللہ کی کریمی

سیبویہ عقائد میں معتزلی تھے کسی نے موت کے بعد ان کو خواب میں دیکھا پوچھا کیا معاملہ ہوا، کہا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو مغفرت کا مستحق تو نہ تھا مگر جاؤ ایک بات پر تم کو بخشتے ہیں کہ تم نے ہمارے نام کو اعرف المعارف کہا ہے۔ تم نے ہمارے نام کی عزت کی ہم بھی تمہاری عزت کرتے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے یہ مسئلہ تدین کی راہ سے نہیں بیان کیا ہوگا بلکہ نحو کی تحقیق کے طور پر یہ کہا ہوگا کہ اعرف المعارف لفظ اللہ ہے مگر اللہ تعالیٰ تو ایسے قدردان ہیں کہ ذرا سی بات پر مغفرت فرمادیتے ہیں۔ مغفرت کو کیا پوچھتے ہو اللہ تعالیٰ تو مغفرت کے لئے بہانے ڈھونڈتے ہیں ؎

رحمت حق بہانہ می جوید (۱)

پھر نام لینا خالی کیونکر جاسکتا ہے۔ اس کو بھی غنیمت سمجھنا چاہیئے۔

(۱) اللہ کی رحمت تو بہانے سے بخشش کرتی ہے۔

درجاتِ ذکر کی تفصیل

یہاں سے ایک بات اور کہتا ہوں وہ یہ کہ متاخرین صوفیاء نے محض ذکر قلبی تجویز کیا ہے وہ بہت اچھی چیز ہے مگر وہ زیادہ دیر تک باقی نہیں رہتا بلکہ کچھ دیر کے بعد دل اِدھر اُدھر چلا جاتا ہے۔ اور ذاکر یہ سمجھتا ہے کہ میں ذکر میں مشغول ہوں۔ اس لئے میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ ذکر لسان سے بھی کرنا چاہیئے اور اسی میں توجہ قلبی رکھنی چاہیئے اگر کچھ دیر میں ذکر قلبی نہ رہے گا تو ذکر لسانی تو باقی رہے گا۔ اور وقت ضائع نہ ہوگا خصوصاً میری اس تحقیق کے بعد کہ جو عمل خالص نیت سے شروع ہو اس کی برکت وانوار مستمر رہتے ہیں (۱)۔ گو وہ نیت مستحضر نہ رہے اور گو توجہ باقی نہ رہے۔ اب جو ہم لوگوں کے ذکر میں انوار نہیں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم کو توجہ کا اور حصول نور کا قصد نہیں ہے۔ اگر قصد ہو تو انوار ضرور حاصل ہوں پس اب یہ بھی کہنا صحیح ہے کہ ''ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر''۔ یعنی جب کہ قصد حصولِ اثر کا نہ ہو اور یہ بھی صحیح ہے کہ ''ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر'' یعنی جبکہ حصولِ اثر کا قصد ہو پس اب دونوں کلام جمع ہو گئے۔

بہرحال ﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ﴾ میں لفظ کو مقحم کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ دوسرے درجہ کے لحاظ سے ہے اور ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ دوسرے درجہ کے اعتبار سے ہے۔ اور ایک درجہ ذکر کا یہ بھی ہے کہ عذاب وثواب کو یاد کیا جائے کیونکہ نصوص میں جابجا عذاب وثواب کے یاد کرنے کا بھی امر وارد ہے یہ بھی ذکر اللہ کی ایک فرد ہے۔ نیز اطاعت احکام بھی اللہ کی یاد میں داخل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت تو احکام کے واسطے ہی سے ہوگی۔ پس ذکر اللہ کے مختلف مراتب ہیں۔

(۱) برکات وانوار مسلسل ہوتے ہیں۔

''دوازدہ تسبیح'' میں ترتیب کی حکمت

اسی واسطے مشائخ نے ذکر میں تدریجی رفتار رکھی ہے چنانچہ ہمارے مشائخ چشتیہ تو ذکر لسانی میں بھی تدریج کرتے ہیں کہ بارہ تسبیح میں اول لا الٰـہ الا اللّٰہ کی تعلیم ہے۔ یہ مبتدی کے لئے مناسب ہے کیونکہ اس کے دل میں ابھی اغیار بھرے ہوئے ہیں۔ تو اس کو چاہیئے کہ اُن کو ذہن میں پیش کر کے تیغ لا سے نفی کرے جب اُن کی نفی ہوگئی (۱) اور دل اغیار سے خالی ہوگیا۔ تو صرف ذکر اثبات الا اللّٰـــہ مناسب ہے (۲) مگر اثبات میں بھی اغیار ایک گونہ استحضار ہے اس لئے اس کے بعد اللّٰـہ اللّٰہ بتلاتے ہیں جس میں محض ذات حق پر توجہ ہے مگر اس میں بھی توجہ بواسطہ اسم کے ہے اس لئے بعضے مشائخ اس کے بعد ذکر ھــو ھــو کی تعلیم کرتے ہیں جس میں ذات پر توجہ ہوتی ہے اسم کا بھی واسطہ نہیں رہتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا رد

علامہ ابن تیمیہ لا الٰــہ الا اللّٰـہ کے سوا ان سب اذکار کو بھی بدعت کہتے ہیں۔ کیونکہ سنت سے ان کا ثبوت نہیں۔ اگر میں اس وقت ہوتا تو ادب کے ساتھ اُن سے استفسار کرتا کہ علماء دین اس مسئلہ پر کیا فرماتے ہیں کہ ایک شخص قرآن حفظ کرتے ہوئے: ﴿ اِذَالسَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ﴾ کے کلمات کو الگ الگ یوں یاد کرتا ہے کہ اول ''اِذَالسَّـمَآءُ نْ اِذَالسَّمَاءُ نْ'' یاد کرتا ہے پھر ''فَـطَرَتْ فَطَرَتْ '' یاد کرتا ہے۔ اس کے بعد دونوں کو ملا کر ﴿اِذَالسَّـمَـاءُ انْفَطَرَتْ﴾ کہتا ہے تو اُس کو اس طرح یاد کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور شبہ کی وجہ یہ ہے کہ ''اِذَالسَّمَاءُ نْ ''لفظ بے معنی ہے اسی طرح ''فَطَرَتْ فَـطَرَتْ'' بے معنی ہے۔ تو میں حلفاً کہتا ہوں کہ ابن تیمیہ اس کو ضرور جائز کہتے اور وجہ یہ بتلاتے کہ یہ تلاوت نہیں ہے نہ اس شخص کو اس وقت تلاوت مقصود ہے بلکہ مقصود

(۱) یعنی معبودان باطل میں سے کوئی عبادت کے لائق نہیں (۲) مگر اللہ تعالیٰ عبادت کے لائق ہے۔

ذہن میں جمانا ہے۔ تو اس پر میں کہتا کہ پھر الااللّٰہ اور اللّٰہ اللّٰہ کرنا کیوں بدعت ہے۔ اس میں بھی تو ذکراللہ کا ذہن میں جمانا ہے اور ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ بنابر تجربہ رسوخ ذکر کے لئے یہ ترتیب بے حد نافع ہے اس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا جس کو شک ہو تجربہ کرکے دیکھ لے اب اگر وہ یہ کہیں کہ جیسا وہ قرآن یاد کرنے والا اس حالت میں تالی نہیں متہی للتلاوت ہے(۱)۔ اس طرح یہ شخص اس حالت میں ذاکر تو نہ ہوا متہئی للذکر ہوا(۲) تو میں کہوں گا کہ انتظار صلوٰۃ بحکم صلوٰۃ ہے اس لئے وہ حکماً ذاکر ہے۔ افسوس یہ ہے کہ کسی نے ان کے سامنے یہ مقدمات ذکر نہیں کئے اس لئے وہ اس کو بدعت کہنے میں معذور ہیں۔ بلکہ طرہ یہ ہوا(۳) کہ ان کے سامنے جہلاء صوفیا کے غلط مقدمات پیش ہوئے چنانچہ بعض نے: ﴿قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ﴾(۴) سے استدلال کیا ہے اس دلیل پر علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے صوفیاء کے بہت لتّے لئے ہیں(۵) اور واقعی اس سے استدلال ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ اس میں لفظ ''اللّٰہ'' قُلُ کا مقولہ نہیں کیونکہ قول کا مقولہ مفرد نہیں ہوتا بلکہ جملہ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ تو اَنْزَلَ مقدر کا فاعل ہے جس کا قرینہ سیاق کلام ہے کیونکہ اوپر ارشاد ہے: ﴿قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ﴾(۶) قل انزلہ اللّٰہ تو یہ استدلال کسی جاہل نے کیا ہوگا ابن تیمیہ کو خوب موقع مل گیا انہوں نے اچھی طرح خبر لی۔ مگر اناڑی طبیب غلطی کرے تو اس سے محمود خان اور

(۱) تلاوت کی تیاری کرنے والا ہے (۲) ذکر کی تیاری کرنے والا (۳) اس پر مزید ظلم یہ کہ (۴) ''آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے پھر ان کو اُن کے مشغلہ میں بیہودگی کے ساتھ لگا رہنے دیجئے'' سورۂ انعام: ۹۲ (۵) صوفیاء کی خوب خبر لی (۶) ''آپ یہ کہیئے کہ وہ کتاب کس نے نازل کی ہے جس کو موسیٰ (علیہ السلام) لائے تھے جس کی یہ کیفیت ہے کہ وہ نور ہے اور لوگوں کے لئے وہ ہدایت ہے جس کو تم نے متفرق اوراق میں رکھ چھوڑا ہے جن کو ظاہر کردیتی ہو اور بہت سی باتوں کو چھپاتی ہو اور تم کو بہت سی ایسی باتیں تعلیم کی گئیں جن کو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے بڑے'' سورۂ انعام: ۹۲۔

عبدالمجید خان سے تو بدگمانی جائز نہ ہوجائیگی۔ ہاں موت خان کو بُرا کہو تو ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں یہ کیا کہ اناڑیوں کے ساتھ محققین کو بھی ایک لکڑی سے ہانکا جائے۔ محققین کے دلائل سنے ہوتے تو ابن تیمیہ کو صوفیاء پر انکار کی ہرگز جرأت نہ ہوتی۔

ذاکرین کے درجات

خلاصہ یہ کہ ذکر کا ایک درجہ یہ ہے کہ اللہ کے نام کو یاد کرو۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ بواسطۂ نام کے ذات کو یاد کرو۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ نام کا واسطہ بھی نہ رہے محض ذات کے ذکر پر قادر ہوجائے۔

تعلقاتِ الٰہی کے درجات

اسی طرح تعلق کا ایک یہ درجہ ہے کہ اگر اس سے یوں بھی کہہ دیا جائے کہ تم کو کسی گناہ پر سزا نہ ہوگی جو چاہو کرو جب بھی احکام کی مخالفت نہ کرے بلکہ اگر یوں کہہ دیا جائے کہ اطاعت پر تم کو سزا ہوگی اور مخالفت پر جنت ملے گی جب بھی مخالفت نہ کرے۔ نیز اگر یوں کہہ دیا جائے کہ تیرا خاتمہ کفر پر ہوگا جب بھی اعمال میں کوتاہی نہ کرے، چنانچہ ایک بزرگ کو ذکر میں آواز آئی کہ جو چاہے کر تو کافر ہوکر مرے گا وہ پریشان ہوگئے مگر ذکر اور نماز وغیرہ نہیں چھوڑی بلکہ شیخ سے جاکر عرض کیا شیخ نے کہا کام میں لگے رہو اس آواز سے پریشان نہ ہو یہ دشنام محبت ہے۔ محبوبوں کی عادت ہے کہ عشّاق کو یوں ہی پریشان کیا کرتے ہیں۔

بدم گفتی وخرسندم عفاک اللہ نکو گفتی جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا(۱)

پریشان کرنا بھی محبت کا ایک رنگ ہے۔

(۱) تم نے مجھے بُرا بھلا کہا بہت اچھا کیا تمہاری شیریں زبان کے لئے یہ کڑوا جواب ہی زیبا ہے۔

ماپروریم دشمن ومامی کشیم دوست کس رارسد نہ چوں و چرادرقضائے ما(۱)

محبت کے مختلف انداز

میرے والد صاحب بچوں کو گود میں کم لیتے تھے۔ بس جب زیادہ محبت کا جوش اٹھتا بچوں کے کلّے پکڑ کر دبادیتے جس سے بچے روپڑتے تھے۔ مستورات کہتیں کہ یہ تمہاری عجیب محبت ہے کہ بچوں کو گود میں لینا کھلانا تو نہیں آتا بس کلّے دبانا آتا ہے جس سے وہ روپڑتے ہیں مگر ان کو اسی میں لطف آتا تھا۔ مجھے بھی بچوں سے مزاح کا شوق ہے جس میں بعض دفعہ انکو غصہ بھی آجاتا ہے۔ ان کی یہ ادائیں پسند آتی ہیں ایسے ہی بلاتشبیہ یوں سمجھئے کہ بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ محبت کی وجہ سے طرح طرح سے پریشان کرتے ہیں ان کا رونا چلانا ان کو پسند ہے کسی کا ہنسنا پسند ہے اُس کو ہنساتے ہیں کسی کا رونا پسند ہے اُس کو رلاتے ہیں ؎

بگوش گل چہ سخن گفتۂ کہ خنداں ست بعند لیب چہ فرمودۂ کہ نالاں ست (۲)

اور

ما پروریم دشمن ومامی کشیم دوست کس رارسد نہ چوں و چرادر قضائے ما

ذکر اللہ کی مختلف صورتیں

اس تفصیل سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ جنت و دوزخ اور عذاب و ثواب کا یاد کرنا بھی اللہ ہی کی یاد ہے کیونکہ ذکر کے مراتب مختلف ہیں پس ذکر کی حقیقت یہ ہے کہ جیسے بعض لوگ باوجود تقاضا کے چوری نہیں کرتے مال گذاری ادا

(۱) میں دشمنوں کو پالتا ہوں اور دوستوں کو سزا دیتا ہوں کسی کو میری قضاء اور قدر میں چوں و چرا کرنے کی اجازت نہیں ہے (۲) پھول کے کان میں کیا کہہ دیا کہ ہنس رہا ہے اور بلبل کو کیا کہہ دیا کہ رو رہی ہے۔

کرنے میں سستی نہیں کرتے کیونکہ ان کو ایک چیز یاد آتی ہے۔ یعنی سزا وقید وغیرہ اسی طرح ایسی چیز کو یاد رکھنا جو معاصی سے روک دے اور طاعات پر ہمت کو چست کردے ذکر اللہ ہے اب اگر کسی کو جنت و دوزخ کی یاد معاصی سے روکے اس کے لئے یہی ذکر اللہ ہے اور کسی کو اللہ اللہ کرنا معاصی سے روکے اُس کے واسطے یہی ذکر اللہ ہے۔ اور جس کو مراقبۂ ذات معاصی سے روکے اس کے واسطے یہی ذکر اللہ ہے اور جس کو یہ چیزیں معاصی سے نہ روکیں اُس کے واسطے یہ ذکر حقیقی نہ ہونگی بلکہ صورت ذکر میں داخل ہونگی اس کو اپنے مناسب حال ذکر حقیقی کسی محقق سے تجویز کرانا چاہیئے مثلاً بعضوں کے لئے نفس پر جرمانہ مالی کرانا معاصی سے مانع ہوتا ہے ان کے واسطے یہی ذکر ہے۔ یہ حقیقت ہے ذکر کی اور یہی جڑ ہے تمام طریق کی بلکہ تمام شریعت کی۔

مقاماتِ ذکر

اب میں چند آیات ذکر کرکے بیان کو ختم کرتا ہوں اور ان آیات کے ذکر سے مقصود یہ دکھلانا ہے کہ تمام اعمال سے مقصود ذکر ہے اور وہی تمام اعمال کی روح اور اساس ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ﴾ (۱) اس سے معلوم ہوا کہ صلوٰۃ سے مقصود ذکر ہے۔ روزہ کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ ﴾ (۲) اور حج کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿فَاذْکُرُوا اللّٰہَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ﴾ (۳) ﴿وَاذْکُرُوا اللّٰہَ فِیْ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ ﴾ (۴) اور: ﴿فَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْھَا صَوَافَّ ﴾ (۵) اور اگر غور کرکے دیکھا جائے تو تمام اعمال میں ذکر موجود

(۱) ''اور میری ہی یاد کے لئے نماز پڑھا کرو'' سورۂ طہٰ:۱۴ (۲) ''اور تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بزرگی بیان کیا کرو اس پر کہ تم کو طریقہ بتلادیا'' سورۂ بقرہ:۱۸۵ (۳) '' تو مشعرِ حرام کے پاس خدا تعالیٰ کی یاد کرو'' سورۂ بقرہ:۱۹۸ (۴) ''اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو کئی روز تک'' سورۂ بقرہ:۲۰۳ (۵) ''سو تم اُن پر کھڑے کرکے اللہ کا نام لیا کرو'' سورۂ حج:۳۶۔

ہے چنانچہ ارشاد ہے: ﴿ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا ﴾(۱) اس سے معلوم ہوا کہ خوف وخشیت وہی معتبر ہے۔ جس کا منشا ذکر اللہ ہے۔ یہ مقامات کا بیان تھا کیونکہ اعمال ہی کو مقامات کہا جاتا ہے۔

احوال ذکر

اب احوال میں غور کیا جائے تو ان میں بھی ذکر کو دخل ہے چنانچہ ارشاد ہے: ﴿ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴾(۲) کہ اللہ کے ذکر ہی سے قلوب کو اطمینان ہوتا ہے اطمینان کے دو درجے ہیں ایک تو مقام ہے جو تصدیق واذہان کا درجہ ہے اور ایک حال ہے جس کو سکون وانس سے تعبیر کیا جاتا ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ نے مطلق اطمینان کے لئے ذکر اللہ کو سبب بتلایا ہے اس لئے اس کے عموم میں مقام وحال دونوں داخل ہیں۔ اور اگر عموم سے استدلال نہ کیا جائے تو مشاہدہ خود اس کی دلیل ہے کیونکہ واقعی دل کو راحت اور چین ذکر اللہ ہی سے نصیب ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

گر گریزی برامید راحتے ہم ازانجا پیشت آید آفتے
ہیچ کنجے بے دودو بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست (۳)

خلوت گاہ سے مراد تعلق مع اللہ ہے۔ جو ذکر اللہ کی اعلیٰ فرد ہے تو ذاکرین کو کیسی راحت ہے کہ وہ کسی حال میں بھی پریشان نہیں ہوتے کیونکہ ان کو ایک ذات سے تعلق ہے جو کچھ ان کو پیش آتا ہے۔ اس کو حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھ کر ہر وقت مطمئن رہتے ہیں ؎

(۱) ''جب اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو ان کے قلوب ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں اُن کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں اُن کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں'' سورۂ انفال:۲ (۲) ''خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہو جاتا ہے'' سورۂ رعد:۲۸ (۳) کوئی آدمی راحت کی تلاش میں کہیں بھی چلا جائے اس کو وہاں مصیبت ہی پیش آئے گی کوئی جگہ تکلیف و پریشانی سے خالی نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کی معیت کے کہیں آرام نہیں ہے۔

موحد بر پائے ریزی زرش چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید وہراشس نباشد زکس ہمیں ست بنیاد توحید وبس (۱)

ذکر کے لئے کوئی حد نہیں

اور چونکہ ذکر ایسی چیز ہے اسی لئے اس کی کوئی حد نہیں حالانکہ نماز کے واسطے ایک حد ہے کہ اوقات مکروہہ میں حرام ہے روزہ کے واسطے حد ہے کہ ایام خمسہ میں حرام ہے۔ زکوٰۃ وصدقہ کے واسطے حد ہے کہ ((خَیْرُ الصَّدَقَۃَ مَاکَانَ عَنْ ظھر غنی)) حج کے واسطے حد ہے۔ مثلاً فرض ادا کرنے کے بعد ایسے شخص کے لئے حج نفل جائز نہیں جس کے حج سے اہل وعیال کے حقوق ضائع ہوں۔ مگر ذکر حقیقی کے لئے جس کی حقیقت یاد ہے کوئی حد نہیں چنانچہ حدیث میں ہے: ((کان رسول اللہ ﷺ یَذْکُرُ اللہ فِی کُلِّ اَحْیَانِہٖ))(۲) کہ رسول اللہ ﷺ ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے تھے۔ اور اس کا غیر محدود ہونا یہاں تک ہے کہ بیت الخلاء میں زبان سے ذکر کرنا گو ممنوع ہے کیونکہ زبان پاخانہ میں ہے مگر دل سے خدا تعالیٰ کو یاد کرنا کہ وہی ذکر حقیقی ہے ممنوع نہیں ہے۔ کیونکہ قلب پاخانہ میں نہیں ہے۔

ذکر قلبی ولسانی میں فرق

اور یہاں سے صوفیاء کے اس قول کی ایک لطیف تائید ہوتی ہے کہ تصفیہ قلب جسم سے باہر ہے وہ دوسرے عالم میں ہے۔ اسی واسطے پاخانہ میں ذکر قلبی ممنوع نہیں کیونکہ قلب یہاں نہیں ہے اور اگر کوئی اس تحقیق کو نہ سمجھے یا نہ مانے تو وہ یوں سمجھ لے کہ قلب ذاکر مثل تعویذ ملفوف کے ہے (۳) اور تعویذ ملفوف کو پاخانہ

(۱) موحد کے قدم نہیں ڈگمگاتے چاہے اس کے سر پر لوہے کے خود رکھ دیے جائیں اس کو نہ کسی سے امید ہوتی ہے نہ کسی کا خوف توحید کے یہی معنی ہیں بس (۲) صحیح للبخاری: ۱/۸۳ (۳) چمڑے وغیرہ میں پڑے ہوئے تعویذ کی طرح۔

میں لے جانا جائز ہے اور گو زبان بھی ملفوف ہے مگر زبان سے ذکر جب ہی ہوسکتا ہے جبکہ لبوں اور دانتوں کو حرکت ہو اور جب لب و دندان (۱) کو حرکت ہوگی تو زبان مستور نہ رہے گی مکشوف ہوجائے گی (۲) اور اگر کوئی شخص بدون لب و دندان کی حرکت کے پاخانہ میں اس طرح ذکر لسانی کرے کہ زبان مکشوف نہ ہو تو یہ صورت جائز ہے مگر وہ ذکر ہی نہیں کیونکہ ذکر و تلاوت کے لئے تصحیح حروف ضروری ہے اور بعض کے نزدیک سماع صوت بھی لازم ہے اور اس کے لئے کشف لسان لازم ہے اور بغیر اس کے جو ذکر ہوگا وہ حکماً ذکر ہے نہ کہ حقیقتاً۔

انسان کی بے بسی

اور یہاں سے انسان کا عجز معلوم ہوتا ہے کہ وہ بدون حرکت لب و دندان کے تکلم و ذکر سے عاجز ہے، امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قدری کو یہی جواب دیا تھا کہ تو جو یہ کہتا ہے کہ افعال عبد بندہ کے مخلوق ہیں۔ ہم تو جب جانیں کہ تو ص کو ض کے مخرج سے نکال دے یا ض کو ص کے مخرج سے نکال دے بس یہاں وہ عاجز ہوگیا یہی وجہ ہے کہ شیر خوار بچہ پیار نہیں کرسکتا کیونکہ پیار کرنے کے لئے منہ کو جس حرکت کی ضرورت ہے بچہ کو یہ طریقۂ پیار نہیں آتا میں نے ایک بچہ کو پیار کیا پھر اُس سے کہا کہ تو بھی پیار کر تو وہ منہ کو گھمانے لگا پیار نہ کرسکا غرض انسان بدون حرکت لب و دندان کے تکلم نہیں کرسکتا اور اس وقت زبان مکشوف ہوجاتی ہے مستور نہیں رہتی اس لئے بیت الخلاء میں ذکر لسانی تو ممنوع ہے۔ مگر ذکر قلبی جائز ہے کیونکہ وہ جسم سے باہر ہے یا مستور ہے۔

---

(۱) ہونٹ اور دانت (۲) چھپی ہوئی نہ رہے گی بلکہ کھل جائے گی۔

سوال و جواب

اب یہاں دو سوال ہیں ایک یہ کہ تم نے بتلایا ہے کہ تمام اعمال کی روح ذکر ہے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جس کو ذکر حاصل ہو جائے اس کو اعمال کی ضرورت نہ رہے کیونکہ روح تو حاصل ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اشکال جب وارد ہوسکتا ہے جبکہ یہ تسلیم کرلیا جائے کہ روح ہی مقصود ہے۔ اور صورت مطلوب نہیں اور یہ مقدمہ غلط ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اولاد کی محض روح مقصود نہیں ورنہ وہ تو بعد موت کے بھی باقی رہتی ہے۔ بلکہ صورت اور روح دونوں کا مجموعہ مقصود ہے۔ اسی لئے موت کے وقت فقدان صورت سے غم ہوتا ہے ورنہ بقائے روح کا تو سب کو یقین ہے۔ دوسرے اوپر بتلا دیا گیا ہے کہ ذکر حقیقی تمام اعمال کی جڑ ہے اور جڑ بدون شاخوں کے کارآمد نہیں ہوسکتی اسی طرح محض ذکر بدون دوسرے اعمال کے کارآمد نہیں۔

دوسرا سوال اور اس کا جواب

دوسرا سوال یہ ہے کہ تم نے ایک وعظ میں ہر عمل کے لئے حد بتلائی ہے جس کے عموم میں ذکر بھی آ گیا اور یہاں ذکر کو غیر محدود بتلایا ہے۔ کہ اس کی کوئی حد نہیں یہ پہلے بیان کے خلاف ہے۔

اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ اُس عموم سے ذکر مستثنیٰ ہے، دوسرا جواب یہ ہے کہ اس کے لئے بھی حد ہے مگر وسیع حد ہے۔ جس کا وقوع شاذ و نادر ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی کو ذکر سے تکلیف ہونے لگے کہ نہ زبان سے ذکر کرسکے نہ دھیان سے اور یہ حالت ان لوگوں کو محسوس ہوتی ہے جو امراض جسمانیہ میں مبتلا رہتے ہیں

کہ ان کو بعض دفعہ ضعف دماغ کی وجہ سے دھیان سے بھی تکلیف ہوتی ہے تو اس شخص کو اس حالت میں ذکر جائز نہیں تا کہ ذکر سے نفرت نہ ہو جائے۔

یہ مسئلہ آپ کسی دوسرے کی زبان سے نہ سنیں گے کیونکہ اول تو کسی کی سمجھ میں یہی بات نہیں آتی کہ دھیان سے تکلیف ہوسکتی ہے اور اگر کسی نے اس کو سمجھ بھی لیا ہو تو اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئیگی کہ تکلیف کے ساتھ ذکر کرنے سے نفرت کیسے ہو جائیگی مگر میں تجربہ کی بناء پر کہتا ہوں کہ بعض دفعہ دھیان سے ایسی تکلیف ہوتی ہے کہ اُس وقت جس چیز کی طرف دھیان جمایا جاتا ہے اس چیز سے دل میں کدورت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس لئے شیخ محقق اس حالت میں دھیان سے منع کردے گا تا کہ ذکر کی محبت باقی رہے مگر ظاہر ہے کہ یہ حالت شاذ و نادر ضرور ہے اس لئے میرا یہ قول صحیح ہے کہ ذکر کے لئے بھی حد ہے مگر وسیع حد ہے۔

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو ذکر کی توفیق عطا فرمائیں اور حقیقت ذکر سے مشرف فرمائیں۔ اور اس کو تمام فروع کے لئے اساس بنادیں۔ آمین (۱)

وصلی اللّٰہ تعالی علی خیر خلقہٖ سیدنا محمد وعلی اٰلہٖ واصحابہٖ اجمعین واٰخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العٰلمین

---

(۱) اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو ذکر حقیقی کی توفیق عنایت فرمائیں۔ آمین

خلیل احمد تھانوی